زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہار سو
مدیر اعلیٰ
سید ضمیر جعفری
راولپنڈی
اشاعتِ خاص

ABC CERTIFIED

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہار سو

راولپنڈی

جلد: ۴ شمارہ ۴۰-۴۱ : مارچ، اپریل۔ ۱۹۹۶ء

قیمت

فی شمارہ	35 روپے
چھ شمارے	150 روپے
زر سالانہ	300 روپے

بیرون ملک (ہوائی ڈاک سے)

امریکہ۔ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ: ۲۵۶۹-۲- گوالمنڈی راولپنڈی۔ ۴۶۰۰۰ فون۔ ۵۴۰۵۶۹ FAX: 419040

شبیہہ ضمیر

قرطاسِ اعزاز

سید ضمیر جعفری

کے نام

نہیں کہ آج کا انسان ابتلا میں نہیں
کوئی حسینؓ مگر آج کربلا میں نہیں

ایک آویزہ کسی کے کان میں
دو جہاں روشن ہیں میری جان میں

ایک نماز سے کم تو نہیں
اک پتھر سرکا نہ بھی

لوگ ہی بے دھیان ہوتے ہیں
راستے مہربان ہوتے ہیں

ظاہر کی چمک کوئی بڑی بات نہیں ہے
افرنگ میں ظلمت ہے مگر رات نہیں ہے

موت کے سامنے کچھ تو شکیبائی ہو
جنگ ہارو بھی تو تلوار پہ رعنائی ہو

یہ بہت کم ہے جہاں کی تیرگی کے واسطے
کوئی سورج اور یارب روشنی کے واسطے

ہر جنگ میں کھیل ہزاروں کا + اک کھیل ہے راجکماروں کا
اپنا اپنا جینے کا زاویہ بھی ہوتا ہے + سورج ایک ہے لیکن دن نیا بھی ہوتا ہے

سوانحی خاکہ

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ولادت: یکم جنوری 1916ء
نام: ضمیر حسین شاہ
مورث اعلیٰ: سید عبدالخالق
والد: سید حیدر شاہ
والدہ: سیدہ سردار بیگم
برادر اکبر: سید بشیر حسین شاہ
اہلیہ: جہاں آرا
اولاد: سید احتشام ضمیر (بریگیڈیئر) سید امتنان ضمیر (مقیم امریکہ)
مولد و مسکن: موضع چک عبدالخالق' تحصیل و ضلع جہلم (منگلا کے قریب)
تعلیم: بی اے' پنجاب یونیورسٹی گاؤں کے ٹاٹ مدرسے گورنمنٹ کالج کیمبل پور (۱۹۳۸ء) اور اسلامیہ کالج لاہور (۱۹۳۸ء)
وسیلہ معاش: ملازمت' قلم اور زمین

آغاز زمانہ غلامی میں معمولی دفتری کلرکی سے کیا۔ دہلی اور شملہ میں "بابو گیری"۔ روزنامہ "احسان" لاہور اور مولانا چراغ حسن حسرت کے منفرد فکاہی ہفت روزہ "شیرازہ" لاہور کی مجلس ادارت سے وابستگی... ہفت روزہ "سدابہار" لاہور کی ایڈیٹری۔ دوسری عالمی جنگ میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ جنوب مشرقی ایشیائی کمان (ہیڈکوارٹر سنگاپور) میں کپتانی۔ تعلق شعبہ تعلقات عامہ سے تھا۔ جس میں مجید ملک' کرنل فیض احمد فیض' میجر چراغ حسن حسرت' کیپٹن ن۔م۔راشد' میجر آغا بابر' کرنل مسعود احمد اور کمانڈر حسن عسکری (ابن سعید جیسے ممتاز اہل قلم شامل تھے۔
۱۹۴۸ء میں سمندر پار سے پاکستان مراجعت ۱۹۴۹ء میں کپتانی سے استعفیٰ... ۱۹۴۹ء ہی میں کرنل مسعود احمد اور کیپٹن انعام قاضی کی شراکت میں راولپنڈی سے اپنا روزنامہ "بادشمال" جاری کیا۔ جو ایک برس سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۵۱ء میں جہلم کے دیہاتی حلقہ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ہار گئے۔
۱۹۵۲ء میں فوج میں دوبارہ واپسی۔ میجر کے رینک سے ریٹائرمنٹ۔
۱۹۴۸ء کی جنگ کشمیر اور ۱۹۶۵ء کی جنگ ستمبر میں عسکری خدمت۔
پندرہ برس تک دارلحکومت پاکستان کے ترقیاتی ادارے کے ڈائریکٹر تعلقات عامہ۔ بعد میں مختلف وقفوں کے ساتھ پاکستان نیشنل سینٹر کے ڈپٹی ڈائریکٹر' وزارت بحالیات افغان مہاجرین میں مشیر اور اکادمی ادبیات پاکستان سے وابستگی

اعزازات: ہمایوں گولڈ میڈل بدست شیخ سر عبدالقادر 1936ء
تمغہ قائداعظم 1967ء
صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی 1985ء

چیدہ چیدہ:

☆ کشمیر میں بھارتی حکومت کے ظالمانہ کردار کے باعث بطور احتجاج اکبر الہ آبادی ایوارڈ (بمعہ خطیر رقم ٹھکرا دیا۔)

☆ قریباً" پچاس کتابوں کے مصنف ضمیر جعفری کا کلام ملک کے چاروں صوبوں کے نصاب میں شامل ہے۔

☆ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میجر مسعود اختر شہید کی جیب سے جو کاغذات برآمد ہوئے اس میں ان کے ہاتھ کا تحریر کردہ ضمیر جعفری کا ترانہ بھی تھا۔

☆ ضمیر جعفری کے گاؤں چک عبدالخالق کو شہر سے ملانے والی سڑک کو ضلع کونسل نے ان کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

☆ ملک کے نامور سائنسدان ڈاکٹر انور نسیم نے ذاتی جیب سے چک عبدالخالق کے اس اسکول میں جہاں سید ضمیر جعفری نے ابتدائی تعلیم حاصل کی وہاں ان کے نام سے ہونہار طلبہ کو سالانہ وظیفہ اور انعام کا اجراء کیا۔

☆ سید ضمیر جعفری کا شمار اسلام آباد کی پہلی اینٹ رکھنے والوں میں ہوتا ہے آپ نے اس کی پلاننگ اور حسن کو دوبالا کرنے کے لئے ان تھک محنت کی اور اس کے کئی مقامات کو خوبصورت ناموں سے موسوم کیا۔

سید ضمیر جعفری کا گاؤں تھانہ دینہ کی حدود میں واقع ہے
ایک باذوق تھانیدار نے بستہ ب کے مشتبہ شہرت افراد کی فہرست کے علاوہ علاقہ کے معزز ترین شخصیتوں کی ایک فہرست میں اپنے دفتر میں آویزاں کر دی تادم تحریر یہ فہرست چار افراد پر مشتمل ہے سرفہرست سید

ضمیر جعفری اور آخر میں چوہدری صدر الطاف مرحوم سابق گورنر پنجاب کا نام ہے۔

اقوالِ ضمیر:

اعلیٰ ترین مزاح وہ ہے جو سوچنے والے کو کامیڈی اور
محسوس کرنے والے کو ٹریجڈی لگے۔

انسان اس وقت بالغ ہوتا ہے جب پہلی بار اپنے اوپر ہنستا ہے

آدمی موت سے نہیں ڈرتا آرزو کی ناتمامی سے ڈرتا ہے

مزاح زمین کی چیز ہے ظرافت
آسمانوں میں نہیں ہوتی۔

فہرست تصانیف
(نامکمل اور ترتیب کے بغیر)

(۱) کارزار (شاعری) ۱۹۴۰ء (۲) لہو ترنگ (شاعری) (۳) جزیروں کے گیت (شاعری) (۴) اڑتے خاکے (فکاہی مضامین) (۵) کھلیان (شاعری) (۶) ہندوستان میں دو برس (نثر) (۷) ملایا اور ملایا کے لوگ (نثر) (۸) ارمغان ضمیر (نعت و منقبت) (۹) کتابی چہرے (مضامین) (۱۰) آفتاب معرفت (سوانح) (۱۱) قریہ جان (شاعری) (۱۲) جنگ کے رنگ (نثر) (۱۳) حرف و حکایت (تالیف) (۱۳) بن بانسری (پنجابی شاعری) (۱۴) من میلہ (سیف الملوک کا منظوم اردو ترجمہ) (۱۵) من کے تار (سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ کے پنجابی ابیات کا منظوم اردو ترجمہ) (۱۶) نعت نذرانہ (شاعری) (۱۷) آزری خسر (ناولٹ) (۱۸) بھنور اور بادبان (شاعری) (۱۹) گورے کالے سپاہی (نثر) (۲۰) میٹھا پانی (نثر) (۲۱) آخری سلیوٹ (تالیف) (۲۲) گنر شیر خان (شاعری) (۲۳) سورج میرے پیچھے (سفرنامہ) (۲۴) ولایتی زعفران (مزاحیہ شاعری انگریزی کی شگفتہ نظموں کے تراجم) (۲۵) گورخند (شگفتہ قبر کتبوں کے منظوم تراجم) (۲۶) سفرنامہ + خبرنامہ (نثر) (۲۷) مافی الضمیر (شاعری) (۲۸) ضمیریات (مزاحیہ شاعری) (۲۹) ضمیر ظرافت (مزاحیہ شاعری) (۳۰) حفیظ نامچہ (ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شخصیت) (۳۱) زبور وطن (قومی نظمیں) (۳۲) پاک فوج کو سلام (شاعری) (۳۳) مسدس بد حالی (شاعری ۱۹۹۶ء) (۳۴) من مندری (شاعری ۱۹۹۶ء) (۳۵) نشاط تماشا (کلیات مزاحیہ شاعری تا ۱۹۹۰ء) (۳۶) ضمیر حاضر ضمیر غائب (نثر) (۳۷) نظر غبارے (صحافتی کالم) (۳۸) وہ پھول جس کا نام نہیں (شاعری کے منظوم تراجم) (۳۹) گہوارہ (بچوں کی نظمیں) (۴۰) شیر محمد شاد (سوانحی خاکہ) (۴۱) نکلو دیس میں (سفرنامہ زیر اشاعت) (۴۲) اوقیانوس کے پار (سفرنامہ زیر اشاعت) (۴۳) شاہی حج (زیر اشاعت) (۴۴) جاپانی جنگ کی لنگوٹی (زیر اشاعت) (۴۵) مارشل لاء اپنی آخر منڈیر پر (زیر اشاعت)

فیملی فوٹو

نذرِ ضمیرؔ

اے ضمیر جعفری اے افتخارِ فکر و فن
تجھ سے روشن تجھ سے تاباں ہے سُخن کی انجمن

طوطیِ شکرفشاں و مصری و قند و نبات
نطقِ شیریں سے ترے شیریں ہوئے رُوح و بدن

زمزموں کو تو نے زمزم سے دیا آبِ دگر
بن گئے شاخِ نوا برگِ گلاب و یاسمن

تو نے کھولا طرۂ گیسوئے تمکینِ ادب
تو نے توڑے زندگی کے کرب کے دار و رسن

غنچۂ لب سے ترے نکلی غزل کی کہکشاں
گلستانِ قہقہہ یہ تجھ سے آیا بانکپن

تیرے لطفِ نطق نے توڑا یبوست کا حصار
عندلیبانِ لطافت ہر طرف ہیں نغمہ زن

تجھ پہ نازاں ہے عروسِ زندگی اے جانِ جاں
تجھ پہ شاداں ہے جہاں، پُورِ علیؑ ابنِ حسنؓ

(چل دیا ہے سوئے حزن و بوم خود عالی وقار)
(چھوڑ کر دارالخلافہ شاعرِ حرماں شکن)

الوداع جانِ اَدب رُوحِ ظرافت الوداع
الوداع کانِ شرافت روحِ عزت الوداع

دو جہاں با صد کرامت شاد شو آباد شو
کامران شو از ہجومِ رنج و غم آزاد شو

ادعیۂ من برائے تو ہمیشہ وافر آند
در حضور و بارگاہِ حضرت حق غافر اند

بشیر حسین ناظم .. اسلام آباد

احمد ندیم قاسمی کے لئے

دل میں یادِ یار بستا ہے
شہر ہے اور بازار بستا ہے

جمیل الدین عالی کے لئے

ہر گھڑی ہر پل جینا چاہیے
روز ساون کا مہینہ چاہیے

شفیق الرحمٰن کے لئے

آج کل جو صورتِ ایام ہے
یہ چراغوں کے دھوئیں کی شام ہے

مشتاق احمد یوسفی کے لئے

یہ کیسا بازار ہے جس میں بکنے کی خاطر آئی ہر دانہ
ہار جیت ہے گویا اپنی جیت ہار گئے اپنوں سے

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

پہاڑوں سے ملیں، نا پہاڑوں سے ملیں
زندگی کی برکتیں کیوں کن بہاؤں سے ملیں

کرنل محمد خان کے لئے

جسم کی منڈی بازار بستا ہے
عشق کرو گے بیوپار بستا ہے

ڈاکٹر وزیر آغا کے لئے

گھر بہوں کا ہم سفر رہنا بھی اچھی بات ہے
راستے سے بے خبر رہنا بھی اچھی بات ہے

احمد فراز کے لئے

تجرباتِ تلخ نے ہر چند سمجھایا ہے
دل مگر دل تھا ترے کوچہ میں لے آیا

بشریٰ رحمٰن کے لئے

ہر گام پہ رونق میلہ بھی ہے
ہر شخص مگر تنہا بھی ہے

مخدوم ربانی اگرو کے لئے

وقت کے سامنے کچھ تو شکیبائی رکھو
جنگ ہارو بھی تو تلوار میں رعنائی رکھو

سرفراز شاہد کے لیے

لوگ ہی سب دھیان بٹاتے ہیں
رستے ویران بہت ہیں

ڈاکٹر انور نسیم کے لیے

پھول دیوار سے ٹوٹ رہے ہیں
پتھروں میں بھی خزانے ہیں بہت

ڈاکٹر وحیدہ کے لیے

دل میں ہر وقت کوئی شمع جلائے رکھنا
اپنے گھر کا کوئی گلدان نہ خالی رکھنا

مسرت لغاری کے لیے

جب کبھی دیکھا کوئی شجر یا حجر نزدیک سے
میں نے یہ دیکھا خدا ہے کس قدر نزدیک سے

پیر عزت شاہ

گاؤں کی گلیاں نہ اینٹوں سے چنو
ان گھروں میں میرا بچپن ہے ابھی

سلمان رشک کے لیے

اچھا ہے کہ اک دن مرنا ہے
مشکل کو تو آسان کرنا ہے

حمیرا رحمٰن کے لیے

یہ جو چاند ستارے ہیں
سب تیرے اشارے ہیں

انعام الحق جاوید کے لیے

ظاہر کی چمک کوئی بڑی بات نہیں ہے
اندر تک میں نکلتا ہے مگر رات نہیں ہے

اسرار الوہاب کے لیے

زندگی تیرا شکر ادا کیا
سارے کچھے دل نے بدلے ہیں

خادم علی جمیل کے لیے

دوستی دریا سے بھی وابستگی صحرا سے بھی
کتنی راہ و رسم تھی اس بے وفا دنیا سے بھی

تبوک میں ضمیر جعفری کے اعزاز میں ایک شام ۱۹۸۵ء

جہلم سے چودہ میل دور ایک گاؤں چک عبدالخالق کے نام سے ہے۔ جو منگلا کے قریب واقع ہے۔ ڈیم کی تعمیر سے پہلے منگلا کا سراغ ہمارے گاؤں کے حوالے سے ملتا تھا۔ یہ گاؤں ہمارے مورث اعلیٰ سید عبدالخالق نے آباد کیا تھا۔ ہمارے بزرگ ایران سے ملتان آئے اور پھر یہاں اس گاؤں میں خیمے گاڑ دیئے۔ آج بھی اس گاؤں میں اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد آباد ہیں۔

میں یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو اسی گاؤں میں پیدا ہوا۔ میرا نام سید ضمیر حسین شاہ رکھا گیا۔ میرے والد کا اسم گرامی سید حیدر شاہ ہے۔

"چک عبدالخالق اپنی طرز کا ایک منفرد گاؤں ہے۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد میں سے سید عبدالخالق نے اسے آباد کیا۔ اس گاؤں میں امیر بھی ہیں اور غریب بھی۔ مگر معروف معنوں میں آپ کو یہاں کوئی غریب نہیں ملے گا۔ یہاں ایک دوسرے کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جاتا۔ کوئی کسی کو کمتر نہیں سمجھتا۔ تین چار صدیوں سے آباد یہ گاؤں پھیلا ہی نہیں۔ اور اس کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ بس جن کو زندہ رہنا ہوتا ہے وہ سو برس تک بھی زندہ رہتے ہیں اور جنہیں مرنا ہوتا ہے وہ جلد ہی مر جاتے ہیں۔ ایسے کئی واقعات سینہ گزٹ کے حوالے سے ملتے ہیں کہ اس گاؤں میں آباد ہمارے خاندان کے افراد میں سے کئی نے دنیا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کسی دوسرے نے دنیا پر لات مار دی۔ تخلیق و تخریب کا سلسلہ اس عرصہ چلتا رہا کہ ہمارے خاندان پر اتنا عروج کبھی آیا ہی نہیں کہ زوال بھی آئے"۔

ہم کسان تھے۔ زمین سے رشتہ رہا۔ مجھے جو علمی وراثت ملی ہے۔ میرے دادا سید احمد شاہ کی عطا اور دین ہے۔ آپ ضلع جہلم کے واحد تاریخی مدرسے کے استاد تھے۔ جو قلعہ رہتاس میں واقع تھا' انگریزوں نے اس مدرسے کو باقاعدہ ایک سکول کی شکل دی اور میرے دادا اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ وہ پچاس ساٹھ برس تک اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر رہے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔ اس پورے علاقے میں ان کی بہت عزت تھی۔ ان کو اب بھی لیجنڈری کردار کی حیثیت حاصل ہے اور ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا جاتا ہے۔ وہ کچھ طلباء کو اپنے گھر پر بھی رکھتے۔ ان کی کفالت کرتے۔ ان کا کھانا ہماری دادی پکاتی اور چولہے کے پاس بیٹھ کر سب اکٹھے کھانا کھاتے۔

ننھیال کی طرف سے بھی علمی ورثے میں بہت کچھ ملا۔ جس کا شعور قدرے بعد میں ہوا۔ میرے پرنانا سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ

پنجابی پوٹھواری لہجے کے مقبول شاعر تھے۔ ان کا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے تھا۔ اس پوٹھوار کے علاقے میں دو ہی عظیم اور مقبول صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ایک صاحب سیف الملوک حضرت میاں محمد بخش اور دوسرے میرے پرنانا سید محمد شاہ آپ اپنا کلام لکھتے نہیں تھے۔ ان کے عقیدت مند جو بڑی تعداد میں تھے ان کے کلام کو محفوظ کر لیتے تھے۔ لوک ورثہ والوں نے من کے تار کے نام سے ان کے ابیات اکٹھے کئے ہیں۔ جن کا اردو ترجمہ کرنے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ پیر سید محمد شاہ کی ہیر ۱۸۰۰ء کے آخری حصے میں منشی گلاب سنگھ ناشر لاہور نے "پیر دی ہیر" کے نام سے شائع کی تھی۔ جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی اور بہت مقبولیت ہوئی۔ پوٹھوار کے دیہات میں ہیر وارث شاہ کو نہیں پڑھا جاتا اپنے لہجے کی وجہ سے سید محمد شاہ کی ہیر کو اس علاقے میں بے پناہ مقبول حاصل ہے۔ اصل میں زندگی کے ROOTS GRASS کو نہیں ہلایا جاسکتا۔ ہیر سید محمد شاہ کی پیر کی جڑیں اس خطے میں بہت گہری ہیں۔ اسی لئے اسی ہیر کو اس علاقے میں مقبولت حاصل ہوئی۔

"منگلا کی وجہ سے اس علاقے کے زیر آب آنے سے پہلے کھنارا شریف میں ہر سال ان کے مزار پر عوامی میلہ لگتا تھا۔ میرے شعری شعور کی چنگاری پیر سید محمد شاہ کی شاعری سے پھوٹی ہے۔ پھر سیف الملوک، جس کی اپنی مقبولیت کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔ جسے میلے ٹھیلوں اور گھروں میں پڑھا جاتا تھا۔

○

"میری بے جی جنہوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ ان کا یہ معمول رہا کہ وہ رات کے پچھلے پہر جس کو ہم لوگ "بڑی سرگی" کہتے ہیں، اٹھ بیٹھتیں پہلے نوافل پڑھتیں پھر کچھ دیر بعد بقدر چار چھ روٹی چکی "پیستیں" پھر نماز فجر کے لئے مصلے پر بیٹھ جاتیں۔ پھر درود پڑھنے کا مرحلہ آتا۔ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد کافی دیر تک ایک لمبی ہزار دانہ تسبیح کے دانوں پر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا وظیفہ چلتا۔ جن میں عربی دعاؤں کے علاوہ پنجابی کے ابیات بھی شامل ہوتے۔ پنجابی ابیات کو جنہیں "مدح شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بے جی دھیمی دھیمی - رہا (لے) کے ساتھ پڑھتیں۔ آواز کے سوز و گداز، چہرے کے خضوع و خشوع اور استغراق کی گہری کیفیت سے جو ان پر طاری ہوتی یوں لگتا جیسے پنجابی کے وہ ابیات بھی ان کی عبادت کا ہی حصہ تھے۔ ہم دونوں بھائی (یعنی بچے) چکی اور مصلے کے پاس ہی کمرے کے اندر یا باہر صحن میں

۱۹۶۴ء بائیں سے دوسرے عسکری ہم قدموں کے ساتھ

سوئے ہوتے عربی کی دعائیں تو ہماری سمجھ میں نہ آتیں- البتہ پنجابی ابیات کا کوئی لفظ پلے پڑ جاتا- یوں مجموعی طور پر عبودیت میں گُمی ہو نغمگی کا رس غنودگی کے ان معصوم لمحات کو سوتے جاگتے کی ایک ایسی میٹھی اور مقتدر کیفیت میں ڈھال دیتا کہ

دونوں جہاں ہوں جیسے میرے اختیار میں

"بے جی نے یہ ابیات اس وقت سے حفظ کر رکھے تھے جب ان کی بے جی .... اپنی صباحوں' سرگیوں میں چکی پیتے وقت اپنی بچی کو گود میں لے کر ان ابیات کا ورد کیا کرتی تھیں- یہ بات ہمیں ہوش سنبھالنے کے بعد جا کر معلوم ہوئی کہ یہ ابیات حضرت میاں محمد بخش کی مثنوی 'سیف الملوک' اور سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ بخاری کی غیر مطبوعہ سی حرفیوں' سے ماخوذ تھے-

"میرے والد محترم بڑے متقی اور پرہیز گار تھے- ہم نے کبھی انہیں کھل کر ہنستے کم ہی دیکھا ہو گا- وہ گھر میں مذہبی رسالے اور اخبارات منگواتے تھے- اس دور میں کوئی بھی ہلکی تحریر نہیں لکھتا تھا- بلکہ ہر تحریر میں ایک خاص اور ادبیت ہوتی تھی- میرے والد براہ راست ایکسائز انسپکٹر بھرتی ہوئے تھے جو اس زمانے میں ایک بڑی بات تھی- اس کے باوجود ان کا جی اس ملازمت میں نہیں لگتا تھا اور انہیں اس محکمے میں ترقی کی بھی کوئی خواہش نہ تھی اس لئے وہ اسی عہدے پر تھے جب ریٹائر ہوئے- میرے دادا کو معلوم تھا کہ میرے والد کو اس ملازمت سے کوئی رغبت نہیں- میرے والد کا عجیب انداز میں حوصلہ بڑھاتے تھے- مجھے اپنے والد کے نام اپنے دادا کے کچھ خطوط دیکھنے کا شرف ملا ہے- دادا میرے والد کو خطوط میں لکھتے تھے-

"حیدر شاہ اللہ کا شکر کر اللہ نے تمہیں دنیاوی آزمائش میں مبتلا کر دیا"

اب اس بات میں جو حکمت ہے اس کی گہرائی میں آج اتر کر دیکھیں تو مذہبی اور اخلاقی اقدار کا جو قلعہ مسمار ہوا ہے اس کی بلند و بالا اور صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے-

"یوں میرے والد اس آزمائش میں پورے اترے اور وہ غریبی میں ہی ایسے نکل آئے جس طرح سے گئے تھے- دادا کے بعد 'میرے والد کی وجہ سے بھی ہماری توقیر اور عزت میں اضافہ ہوا- علاقے میں لوگ میرے والد کی بھی بے حد عزت کرتے تھے-

"ہماری زندگی کا چلن بہت اچھا رہا- گزارہ ہو جاتا تھا- سادگی کی زندگی تھی جس میں تکلفات نہیں تھے- ہمارا شمار آسودہ لوگوں میں ہوتا تھا- بے مانگے ہی مل جاتا تھا- کھانے والے بھی بہت تھے اور دینے والے بھی- میری اپنی طبیعت میں بھی اس بات کا بہت اثر ہے- زندگی کے مشکل لمحوں میں خدا پر تکیہ رہا- دل میں ہمیشہ کہا یہ کام ہو جائے گا تردد کس لئے کریں- اس طرح طبیعت میں ایک بے نیازی پیدا ہو گئی-

ہماری زمین بارانی تھی- کبھی گیہوں کم ہوتی کبھی زیادہ کاشتکاری گھر میں رہی- خود نہیں کرتے تھے- دوسروں سے کراتے تھے بیل وغیرہ اپنے تھے اور دوسرے انتظامات بھی اپنے تھے-

"مجھے بچپن میں پرندے پالنے کا شوق ہوا- میرے ننھیال میں بابا نواب شاہ تھے انہیں بٹیر پرندے پالنے کا بہت شوق تھا- کتے بھی رکھے تھے باز بھی...... جب وہ شکار کو جاتے تو ہم بھی ان کے ساتھ مارے مارے پھرتے- ننھیال میں یہ بزرگ نواب شاہ اپنے ان اشغال کی بدولت غریب رہے- وہ ہمیشہ ہندوؤں اور دوسروں کے مقروض رہے- عجیب طبیعت تھی- جب وہ قرض واپس لینے آتے تو انہیں مارتے تھے- میں نے بٹیر' کبوتر' تیتر وغیرہ پال رکھے تھے- والد صاحب کو یہ شوق پسند تو نہ تھا لیکن محض میری محبت کی وجہ سے سمجھوتہ کئے ہوئے تھے- تاہم انہوں نے یہ سب کچھ گھر پر رکھنے کی اجازت نہ دی اور سب پرندوں کو جلاوطن کر دیا- میں نے اپنی حویلی کے باہر ایک قطعہ زمین میں ان کی اقامت کا اہتمام کیا یوں میں نے ایک چڑیا گھر بنا دیا ایک بار ایف ایل برن جو ڈی سی تھا اور دیہات سدھار میں اس نے بڑا نام کمایا تھا اس علاقے میں دورے پر آیا اور میرا چڑی گھر دیکھا تو کہنے لگا- "یہ کشتی نوح کس نے بنائی ہے"-

"میرا بچپن بڑا دلکش اور مصروف تھا- کھیتوں میں گھومتا جہاں کہیں سوانگی ہو ضرور پہنچتا- میلے ٹھیلے خواہ اپنے گاؤں سے دس میل دور ہوتے وہاں ضرور جاتا- اس زمانے کے میلے ٹھیلے اب کہاں' یادیں ہی باقی ہیں- ان میلوں میں نیزہ اندازی کے مظاہرے ہوتے- کبڈی کے بین الاضلاعی مقابلے نامی گرامی بیلوں کی انعامی ہل دوڑیں ہوتی تھیں- ان گنت بوڑھوں اور جوانوں کے "پڑ" ان میلوں اور تقریبات میں لگا کرتے- مقبول عوامی موسیقار اپنے اپنے علاقے کے راجے خوشحال اور عالم لوہار "چمٹے دو تارے گھڑے اور کھڑتال کی سنگت پر سیف الملوک" کے ابیات الاپتے سنائی دیتے-

جہاں ہیر پڑھی جاتی میں موجود ہوتا سیرت النبیؐ کے جلسوں میں شریک ہوتا- گاؤں میں سیرت النبیؐ کے جلسوں کی سرپرست والد صاحب

ہوا کرتے تھے۔ جو مشائخ ان میں شرکت کے لئے تشریف لاتے ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

○

میرے چار چچا تھے۔ ان میں ایک رئیس تھے۔ (بعد کے زمانے کے مطابق وہ رئیس رہے) انہیں اچھی گھوڑیاں رکھنے کا شوق تھا۔ کتوں کے مقابلے بھی ہوتے اور نیزہ بازی بھی۔ یوں یہ ماحول تھا جس میں ایک طرف درویشی تھی اور دوسری طرف کھیل تماشے' میلے ٹھیلے' ڈھول ڈھمکا' جن میں میری پرورش ہوئی۔

ہم دو بھائی تھے اور بھی تھے لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ والد صاحب بسلسلہ ملازمت جہاں جہاں گے۔ وہاں بھی آنا جانا رہا۔ مگر بنیادی حیثیت گاؤں کے گھر کو ہی حاصل رہی۔ میرے والد نے اپنی ملازمت کو ہمیشہ عارضی سمجھا اس لئے بھی گاؤں سے اپنا تعلق رہا۔ "گاؤں میں لوئر مڈل سکول تھا۔ عام سکول جہاں ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھائی ہوتی تھی۔ میرے اساتذہ میں منشی نور حسین صاحب وفا (منشی فاضل تھے۔ بڑی قلندر' وضع کے استاد تھے۔ لمبے پٹے رکھ چھوڑے تھے۔ کلائی میں کچرے پہنتے موصوف چکوال کے رہنے والے تھے۔ انہیں دیکھ کر دل میں احترام پیدا ہوتا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان جیسی وضع قطع کے لوگوں کو آج کے زمانے میں کوئی ملازمت ہی نہیں ملتی۔ بہرحال وہ شاعر تھے وہ مجھ سے کتاب سے شعر پڑھواتے اور دوسرے طالب علموں کو بتاتے کہ شعر ایسے پڑھے جاتے ہیں اور وہ بھی میری طرح شعر پڑھا کریں۔ میں واقعی ربط اور آہنگ سے شعر پڑھتا تھا۔ میرا شاعری کے ساتھ شغف بڑھتا رہا۔

ایک طرف تو شاعری کا شعور بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف میرے مشاغل شعریت کی ضد تھے۔ ہمارے زمانے میں ایک کھیل بہت مقبول تھا۔ اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں یہ کھیل ضلع گجرات اور جہلم کی تحصیل تک ہی محدود تھا۔ اس کھیل کو "تلیاں" کہا جاتا تھا۔ یہ مکے بازی کی ایک شکل تھی۔ دو آدمی میدان میں اترتے۔ وہ پیشہ ور بھی ہو سکتے تھے۔ انہوں نے جسم پر زبردست مالش کی ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو باری باری پوری طاقت سے پانچ پانچ مکے مارتے تھے۔ جب مکا مارنے والا مکا مارنے لگتا تو اس کا مدمقابل اس کی کلائی پکڑنے اور روکنے کی کوشش کرتا۔ دوسرا مکا مار کر اسے گرانے کی کوشش کرتا۔ یہ طاقت اور پھرتی کا کھیل تھا۔ ہزاروں لوگ "تلیاں" کے مقابلے دیکھنے' گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر آتے تھے۔ میں بھی ان اکھاڑوں میں اترتا اور مقابلوں میں حصہ لیتا رہا اور میں ہمیشہ ان مقابلوں میں برابر چھوٹتا رہا۔ "اس کھیل میں بڑی دہشت تھی۔ اس کھیل کی وجہ سے میرے فن پر گہرے اثرات مرتب ہوئے غیر شعوری طور پر میری شاعری اور فن میں جو گداز پیدا ہوا۔ اس کی وجہ یہ کھیل تھا۔ میری شاعری میں جارحانہ پن (AGGRESSIM) نہیں ہے۔ اس کھیل کی وجہ سے اس کی نوک کند ہو گئی۔ میں نے کبڈی بھی خوب کھیلی۔ اتنا تھک جاتا کہ بعد میں مالش بھی کروانی پڑتی تھی۔

"گاؤں کی زندگی' گاؤں کا معاشرہ' گاؤں کی خوشبو میری شاعری کا نمایاں ترین حوالہ ہے۔

"بات سے بات نکلی ہے تو یاد آیا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب میں ایف اے میں پڑھتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے نظموں کے ایک مقابلے کا اعلان ہوا۔ میں نے بھی اس مقابلے میں ایک نظم "گاؤں کی ایک شام" کے عنوان سے لکھی اور بھجوا دی اور بھول گیا۔ مجھے اس مقابلے میں پہلا انعام ملا۔ یہ ہمایوں گولڈ میڈل تھا۔ وائی ایم سی اے ہال میں تقریب ہوئی۔ شیخ سر عبدالقادر نے مجھے وہ میڈل دیا۔ انہوں نے اس تقریب میں فرمایا تھا کہ اس مقابلے میں سینکڑوں شاعروں میں سے دس شاعروں کو بلوایا گیا۔ مگر گولڈ میڈل کی حقدار میری نظم ٹھہری۔

"ہاں تو بات تعلیم کی ہو رہی تھی۔ سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول جہلم میں داخلہ لیا۔ گاؤں سے جہلم کا فاصلہ پندرہ میل تھا۔ راجتاں سے میں پیدل سکول جاتا اور روزانہ پیدل واپس آتا۔ کچھ عرصے کے بعد والد صاحب نے سائیکل لے دیا یوں میں ہر روز تیس میل فاصلہ طے کر کے سکول پڑھنے جاتا اور واپس آتا تھا۔ بعد میں والد صاحب نے جہلم ہی میں مکان بنوا لیا۔ یہ مکان والدہ کے اصرار پر بنایا گیا وہ کہتی تھیں کہ بچوں کو روزانہ اتنا فاصلہ طے کر کے سکول جانا پڑتا ہے۔ بہرحال گاؤں چک عبدالخالق سے رشتہ نہیں ٹوٹا۔ وہاں آنا جانا جاری رہا۔

گورنمنٹ ہائی سکول جہلم میں فارسی کے استاد اور بزم ادب کے انچارج سید اقبال احمد تھے۔ ہم نے بھی ساتویں' آٹھویں سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا سکول کے ایک اور استاد ماسٹر اننت رام تھے جو اردو میں شعر کہتے تھے سید اقبال حسین زنجانی اپنے اطوار سے شاعر بھی لگتے تھے کیونکہ وہ غیر منظم اور بے ترتیب تھے۔ اس زمانے میں چار پانچ لڑکے

بطور شاعر سکول میں نمایاں ہوئے جو خوبصورت تھے انہیں تو سید زنجانی صاحب نے اپنی آغوش شفقت میں لے لیا اور باقی لالہ اننت رام نے سنبھال لئے۔ مجھ پر ان دونوں کی نوازش تھی۔ سکول میں سالانہ جلسوں میں نظمیں پڑھیں۔ مشاعروں میں شرکت کی۔ یوں تربیت بھی ہوئی اور حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ شاعری کا چسکا لگ گیا۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں راجہ ہری سنگھ کے خلاف بھی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں جہلم میں بھی جلسے ہوئے تھے۔ کشمیر کی طرف جتھے روانہ ہونے لگے۔ جو گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ جب میں نے ایک باغیانہ نظم پڑھی پولیس پکڑ کر تھانے میں لے گئی۔ وہاں ہمارے جاننے والے مجسٹریٹ صاحب موجود تھے۔ وہ ہمارے کرایہ دار تھے انہوں نے مجھے بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس طرح سے کشمیر کے ساتھ ہمارے تعلق کا آغاز ہوا جو پھر بڑھتا چلا گیا۔

مجھے سکول میں "ذہین نالائق" طالب علم گردانا جاتا تھا۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے فرمایا "یا تو تم فرسٹ ڈویژن لو گے یا پھر فیل ہو جاؤ گے" ایسا ہی ہوا اور میں فیل ہو گیا۔ دوسرے برس جب پھر میٹرک کا امتحان دیا تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا۔ اصل میں حساب بہت کمزور تھا۔ کالج گیا تو حساب سے جان چھوٹ گئی اور پھر میں نے کالج میں ہمیشہ اچھی سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ ایک دو نمبروں کی کمی سے فرسٹ ڈویژن رہ جاتی تھی۔ "جملے بازی میں بہت اچھا رہتا تھا۔ کلاس میں اپنی حاضر جوابی اور مزاح کی وجہ سے ممتاز رہتا۔ مزاح کی حس قدرت نے خداداد عطا کی تھی۔ جو بعد میں نظم و نثر میں کام آئی....

"میں پہلی بار میٹرک میں فیل ہوا تو مجھے کیمبل پور بھیج دیا گیا۔ جہاں میرے چچا محمد شاہ رہتے تھے۔ اس زمانے میں جب والدین یہ چاہتے کہ ان کے بچوں میں نظم و ضبط اور باقاعدگی پیدا ہو تو وہ بچوں کو اپنے بھائیوں یا عزیزوں کے پاس بھجوا دیتے تھے کہ ان کی بہتر اور موثر نگرانی کر سکیں گے۔ میٹرک میں نے کیمبل پور سے پاس کیا گورنمنٹ انٹر کالج سے ایف اے کیا۔

کالج کا یہ زمانہ میری زندگی کا اہم دور تھا۔ جب میں ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوا۔ شاعری تو میں نے شروع کر رکھی تھی لیکن صحیح معنوں میں ادبی اور شعری نشوونما کالج میں ہوئی۔ میں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ ایک اور بات بتاتا چلوں کہ میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کبھی کسی سے اصلاح لینے کا خیال ہی نہ آیا۔ استفادہ سب سے کیا اور اب تک کرتا ہوں۔

کالج میں ہماری انگریزی کے استاد پروفیسر ایش کمار تھے جو اردو کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ کالج میگزین کے انچارج تھے انہوں نے مجھے اس کا مدیر بنا دیا۔ پروفیسر ایش کمار مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ غالب اور اقبال کے شیفتہ تھے۔ تقسیم کے وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ بعد میں بھارت میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے، بھارت میں انہوں نے غالب اور اقبال کی شاعری اور افکار پر انگریزی میں کتابیں بھی لکھیں۔ افسانہ نگار بھی تھے۔ پروفیسر ایش کمار نے میری ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔

ہاں ایک یادگار واقعہ بیان کروں گا کہ استاد کا احترام کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام جھنگ میں پروفیسر ایش کمار کے شاگرد رہے تھے۔ جب ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام ملا تو دہلی۔(بھارت) میں انہیں زبردست استقبالیہ دیا گیا۔ اندرا گاندھی اس تقریب کی صدارت کے لئے آئی تھیں۔ اس تقریب میں پروفیسر ایش کمار آخری نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے انہیں دیکھ لیا اور مسز اندرا گاندھی کو بتایا کہ ان کے استاد آخری نشستوں میں بیٹھے ہیں۔ انہیں سٹیج پر بلانا چاہئے۔ مسز اندرا گاندھی خود پروفیسر ایش کمار کے پاس گئیں اور انہیں اوپر لے آئیں.....

"مجھے اپنی تعریف منظور ہے نہ خودستائی کہ ملتان کے ایک پروفیسر میانہ صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ میرے استاد چراغ حسن حسرت پر پہلے پی ایچ ڈی کریں۔ چراغ حسن حسرت میرے استاد تھے ان کے احترام کا تقاضا تھا کہ میں نے یہ مشورہ دیا۔ اور پروفیسر میانہ نے میرے مشورے کو قبول کر کے مولانا چراغ حسن حسرت پر پی ایچ ڈی کی۔

"کیمبل پور کالج سے میں نے ایف اے کیا اور باقاعدہ شاعری شروع کی۔ غلام جیلانی اصغر بھی اسی کالج میں مجھ سے جونیئر تھے۔"

"بی اے میں داخلے کے لئے میں اسلامیہ کالج لاہور آیا۔ اس زمانے میں عبداللہ یوسف علی کالج کے پرنسپل تھے۔ داخلے کے امیدوار طالب علموں سے وہ رسمی سا انٹرویو لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ان کے سامنے پیش ہوا اور انہوں نے جو سوال پوچھا، جواب مجھے یاد

واہ چھاؤنی کے مشاعرے میں جوش صاحب کلام سنا رہے ہیں راز مراد آبادی، ضمیر جعفری اور یوسف ظفر داد دے رہے ہیں۔

نہیں اس کا جواب تعظیم سے جھک کر دیا تو علامہ یوسف عبداللہ نے فرمایا:

""مسلمان جھک کر بات نہیں کرتے"

"علامہ عبداللہ یوسف علی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کی وجہ سے اسلامیہ کالج لاہور کا ہندوستان بھر کی درسگاہوں میں منفرد مقام تھا۔ اسلامیہ کالج کا ہر طالب علم ان پر فخر کرتا تھا یہ علامہ عبداللہ یوسف علی کی شخصیت تھی کہ جس نے بعد میں یہ شعور عطا کیا کہ ایک شخص کس طرح پورے عہد کو متاثر کرتا ہے۔ نپولین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اکیلا ایک فوج کے برابر تھا۔ تو علامہ عبداللہ یوسف علی بھی ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔

اسلامیہ کالج لاہور میں آیا تو گویا ادب کے تالاب سے ادب کے بحیرہ اوقیانوس میں آگیا۔ لاہور اور وہ بھی اس صدی کے تیسرے عشرے کا لاہور۔ قد آوران علم و ادب کا شہر لاہور، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کا لاہور، تابش صدیقی اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے۔ اختر ہوشیار پوری کا بھی خاصا چرچا تھا۔ یہ ہمارے ہم عصر تھے۔ سیاسی اور مجلسی سرگرمیوں میں مجید نظامی اور مولانا عبدالستار خان نیازی، عبدالسلام خورشید، عبداللہ ملک بہت نمایاں تھے۔ جسٹس) انوار الحق مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

""قائد اعظم مسلم لیگ کی احیاء کے لئے لاہور آنے جانے لگے تھے۔ موچی دروازے میں جلسے ہوتے تو اسلامیہ کالج کے طالب علم ان میں جوق در جوق شرکت کرتے۔ پاکستان کی جنگ کا پینیترہ بندھا نظر آرہا تھا۔ تاریخی تناظر میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شمالی ہند (پنجاب) میں پاکستان کا پہلا مورچہ اسلامیہ کالج لاہور میں لگا۔

""اسلامیہ کالج کا میگزین کریسنٹ تھا۔ یہ ایک باوقار مجلہ تھا۔ میں اس میں لکھنے لگا۔ جب میں فورتھ ایر کا طالب علم تھا تو اس کی ادارت کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔ ڈاکٹر تاثیر کالج سے جا چکے تھے لیکن ان کے ادبی سائے محسوس کئے جاتے تھے۔ ان کی قائم کردہ بزم فروغ اردو کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ دوسرے اساتذہ میں جناب حمید احمد خان اور خواجہ دل محمد بہت ممتاز تھے۔ کریسنٹ کی ادارت میرے لئے بلاشبہ ایک بڑا اعزاز تھی مجھ سے پہلے محمود نظامی اور مرزا ادیب اس کے مدیر رہ چکے تھے۔

میں ذاتی طور پر اختر شیرانی کے نیازمندوں میں شامل ہو گیا۔ اختر

شیرانی اپنے نامور محقق والد حافظ محمود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے ان کا یہ گھر اسلامیہ کالج کے قریب تھا- یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اختر شیرانی اور حافظ محمود شیرانی ایک ہی گھر میں رہتے تھے- پھر بھی مدتوں ایک دوسرے سے ملتے تک نہ تھے- اختر شیرانی ایک ادبی جریدہ "رومان" کے نام سے نکالتے تھے- اختر شیرانی تو کیا پرچہ نکالتے- شیخ محمد نواب صاحب کشمیری بازار لاہور میں رہتے تھے- اختر شیرانی ان سے یہ پرچہ نکلواتے تھے- میں ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا- اختر شیرانی وہاں بھی تشریف لے آتے- ان کے نیازمندوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا- احمد ندیم قاسمی' اپندر ناتھ اشک (جنس) عطا اللہ سجاد' سید محمد جعفری' غلام عباس اور راجہ مہدی علی خاں جیسے کتنے ہی نئے لکھنے والے ان کے ہاں آتے جاتے تھے-

۱۹۳۸ء سب سے دلگداز واقعہ علامہ اقبال کی وفات ہے- میں نے لاہور شہر کو کبھی اتنا سوگوار نہیں دیکھا جتنا علامہ اقبال کی وفات کے دن دیکھا- مجھے علامہ اقبال کے جنازے میں شرکت کی سعادت بھی حاصل ہوئی- علامہ اقبال دلوں پر راج کرتے تھے- عام آدمی جو علامہ اقبال کے شعروں کو پڑھ سکتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے نہ ہی انہوں نے کبھی ان کو دیکھا ہو گا وہ سب اس دن رو رہے تھے- وہ لوگوں کے دلوں میں بستے تھے-

۱۹۳۸ء میں میں نے گریجویشن کر لی- اس زمانے میں متعدد اخبارات و جرائد میں شعری گلدستے شائع ہوا کرتے تھے- ہندوؤں کے اخبار "ملاپ اور پرتاپ" میں یہ شعری گلدستے زیادہ چھپتے تھے میں بھی ان میں چھپنے لگا- کالج میں طالب علمی کے دور میں ہی ادب لطیف' ساقی' ہمایوں اور اخبارات میں میرا کلام شائع ہونے لگا- مشاعروں میں بھی پڑھنے لگا- مقبول ہو گیا- ریڈیو کے مشاعروں میں بھی جانے لگا- اور سب سے بڑی بات پیسے لے کر باہر کے مشاعروں میں بھی پڑھنے لگا-

"لاہور کے ادبی حلقوں میں احسان دانش بہت مقبول تھے- قمر جلال آبادی ہندو شاعر تھے ان کا بھی چرچا تھا- وہ ترنم سے بہت اچھا پڑھتے تھے- تقسیم کے بعد وہ بمبئی چلے گئے- لاہور سے خوشتر گرامی کا پرچہ بیسویں صدی نکلتا تھا- جو بہت مقبول تھا- بیسویں صدی' کا دفتر سب سے منضبط اور بہتر تھا- خوشتر گرامی کی یہ خوبی تھی کہ ان کے رسالے بیسویں صدی میں جو چیز بھی شائع ہوتی وہ اس کا کچھ نہ کچھ معاوضہ ضرور دیتے تھے-

عابد علی عابد' صوفی تبسم' مولانا عبدالمجید سالک' چراغ حسن حسرت'

ادبی تقریب میں مداحوں کے درمیان

امتیاز علی تاج' نیاز مندان لاہور سے بھی میرے گہرے تعلقات تھے۔ اور وہ جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ان کا طوطی بولتا تھا تو وہ حفیظ جالندھری تھے جن سے نیاز مندی کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر تعلقات میں گہرائی اور گیرائی آئی اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

مولانا چراغ حسن حسرت سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ آپ احسان' شہباز' زمیندار میں سند باد جہازی کے نام سے مدتوں کالم لکھتے رہے۔ جب انہوں نے اپنا جریدہ "شیرازہ" جاری کیا تو انہوں نے مجھے مدیر معاون بنا لیا۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا۔ لیکن میں نے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین تو کرینٹ میں ہی لکھنے شروع کئے تھے اب شیرازہ جیسے بڑے پرچے میں بھی میرے مزاحیہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ بی اے کرنے کے بعد لاہور میں ٹک گیا۔ جب ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان پیش ہوئی اور منظور کی گئی تو اس تاریخ ساز لمحے میں دری کے حاشیے پر کھڑا ساری کاروائی دیکھ رہا تھا تاریخ نے یہ اتفاقی اعزاز ہمارے حصے میں بخشا ہے جب قرارداد پاکستان منظور ہو رہی تھی تو میں اس تاریخ ساز جلسے میں موجود تھا۔

"لاہور کا جتنا ذکر کروں کم ہے۔ نابغہ روزگار شخصیات لاہور کا وقار تھیں۔ شیخ سر عبدالقادر ادبی جلسوں کی صدارتیں کرتے۔ مولانا صلاح الدین احمد' مولانا حامد علی خاں' غلام رسول مہر' اور عبدالمجید سالک' مولانا ظفر علی خاں' کن کن کا ذکر کروں۔ میں اہتمام سے ادبی اور سیاسی جلسوں میں شرکت کرتا۔

"زمیندار" کا یہ عروج کا زمانہ تھا۔ ایک منظر ہے کہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جون کے مہینے میں ایک چلچلاتی دھوپ میں' میں نے مولانا ظفر علی خان کو پیدل چلتے دیکھا۔ میں سائیکل پر سوار تھا۔ ریلوے سٹیشن کے پاس "زمیندار" کا دفتر تھا۔ میں نے مولانا ظفر علی خان کو لکشمی چوک تک چلچلاتی دھوپ میں پیدل چلتے دیکھا۔ آج اگر وہ سڑک ان کے نام سے منسوب ہے تو یہ ان کا حق بنتا تھا۔ اس سڑک پر مولانا ظفر علی خان نے انگریزوں کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔

"اختر شیرانی' مولانا چراغ حسن حسرت کے بعد جس شخصیت کا اثر مجھ پر بہت گہرا اور دیرپا ہے وہ مولانا صلاح الدین ہیں۔ میں نے ان سے بہت فیض پایا۔ اپنا مجموعہ کلام "قریہ جاں" میں نے مولانا صلاح الدین کے نام معنون کیا ہے۔

"اس زمانے میں ہمیں بھی ایڈیٹری کی پیش کش ہوئی۔ "سدا بہار" کے نام سے ایک رسالہ اردو بازار سے نکلتا تھا۔ ہماری بھی بڑی تمنا تھی کہ ہم ایڈیٹر بنیں۔ سو یہ آرزو دلچسپ انداز میں پوری ہوئی۔ "سدا بہار" کے مالک عبدالعلیم انصاری تھے' جو مسعود بھگوان کے بڑے بھائی تھے۔ "سدا بہار" کا دفتر ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ بیسویں صدی کی طرح منضبط' کئی کمرے تھے' ٹیلی فون بھی تھا۔ ہمیں بھی ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک علیحدہ کمرہ مل گیا۔ اسی روپے ماہوار' تنخواہ مقرر ہوئی جو اس زمانے میں بڑی معقول تنخواہ تھی۔ ہم بہت خوش ہوئے لیکن ہماری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ "سدا بہار" کے مالک نے ہمیں کہا کہ پرچے کے بس دو چار صفحے آپ کے اختیار میں ہیں۔ باقی قینچی سے کام چلائیں اور وہی چھاپیں۔ ہمیں اسے غزلوں کا رسالہ نہیں بنانا ہے۔ ہم "سدا بہار" کے لئے اچھے تراشوں کا انتخاب کرتے رہے' معیار بھی بنایا مگر چونکہ وہ شاعری چھپنے نہیں دیتے تھے۔ اس لئے ہماری تشفی نہ ہوئی اس رسالے "سدا بہار" میں اشتہار بہت چھپتے تھے اور پرچہ بس دو ڈھائی سو کی تعداد میں شائع کیا جاتا تھا۔ جس امید میں ہم ایڈیٹر بنے تھے وہ تو دم توڑ گئی ہم نے ایڈیٹری چھوڑ دی۔ ادھر گھر والوں کا بھی بڑا دباؤ تھا کہ کوئی ڈھنگ کی ملازمت کرو۔

ہمارے خاندان کا ذریعہ روزگار یا تو کھیتی باڑی تھی یا ملازمت اس وقت ہمارے خاندانی علاقے میں ایک اور رواج بھی تھا کہ کسی ایک فرد کی یہ ذمے داری ہوتی تھی کہ وہ گھر پر رہے' وہ خود کام نہ کرتا تھا۔ اس کی ذمے داری یہ ہوتی کہ کھیتی باڑی پر نظر رکھے۔ گھر پر رہے کہ کوئی زمینوں پر قبضہ نہ کرے۔ بہرحال یہ ایک روایت تھی جو چلی آرہی تھی کہ گھر کا ایک فرد بے کار رہتا اور گھر ہی رہتا۔ وہ رضاکارانہ گھر پر رہنا قبول کرتا اور اس کی اور اس کے خاندان کی پرورش دوسرے بھائی کرتے تھے۔

"میرا بھی دل کچھ بھر گیا تھا۔ "سدا بہار" کی ایڈیٹری چھوڑی' سرکاری نوکری کی عمر بھی نکلتی جا رہی تھی۔ اس لئے جہلم آگیا۔ اس وقت جہلم میں کئی شاعر اور دوست حضرات جمع تھے۔ ایک سراج الدین ظفر تھے' جو مجھ سے سینئر تھے۔ ان دنوں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر جہلم کا افسر مال لگا ہوا تھا۔ اس نے ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کی۔ ابھی اس نے شعر کہنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اچکن پہنتا تھا اور اس پر خوب بجتی تھی۔ اسے تو اچکن پہننے کا بہانہ چاہئے تھا۔ یہ اس کی جوانی کا دور تھا۔ میں نے

تو اسے بڑھاپے میں بھی دیکھا ہے اور بخدا میں نے بڑھاپے اور جوانی میں ایسا خوبصورت سکھ اس کے سوا کوئی نہیں دیکھا۔ اس وقت جہلم کے ڈپٹی کمشنر فیض الحسن بدرالدین طیب جی تھے جو مسلمانوں کے نامور لیڈر طیب جی کے صاحبزادے تھے۔ انہیں اردو نہیں آتی تھی ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے تھے لیکن مشاعروں کی سرپرستی کرتے۔ اچکن اور چوڑیدار پاجامہ پہن کر مشاعروں میں آتے۔ انہوں نے جہلم میں اردو کی بڑی سرپرستی کی۔

جہلم کے ایس پی اعتزاز الدین لوہارو تھے' جو رشتے میں جمیل الدین عالی کے ماموں لگتے تھے۔ ویسے ایک دلچسپ بات بتاؤں میں نے جمیل الدین عالی کے جتنے ماموں دیکھے وہ سب عالی سے عمر میں چھوٹے تھے۔ انہوں نے بھی اردو کی بہت سرپرستی کی۔

اس طرح جہلم میں مہتمم بندوبست پی این تھاپڑ تھے۔ وہ بھی ادبی مجلسوں کے سرپرست تھے۔ اسے حسن اتفاق کہئے کہ اس وقت جہلم میں جتنے بڑے سرکاری افسر تھے' وہ سب کے سب اردو اور شعروادب میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اس لئے جہلم میں اس زمانے میں شعری اور ادبی سرگرمیاں بڑے زوروں پر تھیں۔

"ایک اور بات بتاؤں...... دوسری جنگ عظیم میں جب برطانوی ہند میں سونگ پبلسٹی SONG PUBLICITY کا محکمہ قائم ہوا تو چوہدری محمد علی اس میں حفیظ جالندھری کو محکمے کا سربراہ بنا کر لئے گئے۔ پی این تھاپڑ بھی اس شعبے میں گئے تو وہ ہری چند اختر کو اپنے ساتھ لے گئے یہ دلچسپ واقعہ ہے"

"میری سرکاری ملازمت کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ اس لئے پی این تھاپڑ نے مجھے براہ راست گرداور بھرتی کر لیا اور یہ بھی بتایا کہ جنگ ختم ہوئی تو نائب تحصیلدار بن جاؤ گے۔ بہرحال میں گرداور بن گیا۔"

"اسی زمانے میں' میں نے اپنے علاقے میں مسلم لیگ قائم کی۔ اس علاقے میں سوائے غضنفر علی خان کے کوئی دوسرا مسلم لیگی نہیں تھا۔ علاقے میں مسلم لیگ کی تشکیل و تنظیم کے کام میں چوہدری اویس نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ جس کا بیٹا چوہدری الطاف اب قومی اسمبلی کا رکن ہے۔"

"یہ گرداوری کی ملازمت میرے بس کا روگ نہ تھی۔ مجھے اس سے وحشت ہونے لگی۔ محکمہ مال کی زبان نہ تو مجھ سے پڑھی جاتی تھی اور نہ ہی سمجھ میں آتی تھی۔ اس عرصہ میں ایک بار فوج میں کمیشن کے لئے بھی درخواست دی۔ انٹرویو راولپنڈی میں ہوا۔ انٹرویو لینے والوں میں ایک اعلیٰ انگریز افسر تھا اور دوسرے سردار بہادر موہن سنگھ' جو آدھی راولپنڈی کے مالک تھے اور جن کی کوٹھی میں بعد میں ہمارے صدر مملکت چوہدری فضل الٰہی بھی رہتے رہے۔

بہرحال مجھے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ اصل میں ضلع جہلم کے ڈی سی نے اپنی RECOMMENDATION میں یہ لکھ دیا تھا کہ میں شاعر بھی اچھا ہوں۔ اچھا بھلا انٹرویو چل رہا تھا کہ جب میرے شاعر ہونے کا علم ہوا تو مجھے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ سردار موہن سنگھ نے البتہ سفارش کی کہ اس کا ڈیل ڈول اچھا ہے مگر کمیشن نہ ملا۔ انہوں نے مجھے رقعہ دیا کہ میں جمعدار کا کمیشن لے لوں۔ اس زمانے میں جمعدار کا عہدہ بھی بہت اہم ہوتا تھا بہرحال میں وہاں انٹرویو دینے دوسرے دن گیا۔ میرا تو خیال تھا کہ جنرل بارلٹے خود میرا استقبال کرے گا۔ مگر وہاں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ امیدواروں کا ہجوم تھا۔ لوگ امیدواروں کے ساتھ اپنے فوجی میڈلوں سے لدے پھندے آئے تھے۔ اپنے پاس نہ میڈل تھا نہ کسی پرانے فوجی کی سفارش۔ گورکھا صوبیدار آیا۔ اندر لے جایا گیا۔ خوب ٹھونک بجا کر سارے جسم کو ننگا کر کے دیکھا اور پھر ریجیکٹ کر دیا۔ خرابی بتائی KNEES BAD یعنی گھٹنے بجتے ہیں۔ شاعر تھا' دل نے کہا چلو جو بجنے کی چیز ہے بجتی ہے.....

"گرداوری چھوڑ چکا تھا۔ دلی چلا گیا۔ وہ ہمارے ایک رشتے دار ایک دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے انہوں نے اسسٹنٹ کی ملازمت دلوا دی۔ اسسٹنٹ کلرک سے ذرا بہتر ہوتا ہے۔ ملازمت وزارت دفاع میں ملی اس لئے اس کے صدقے شملے میں بھی رہے۔

۱۹۴۴ء میں فوج کے تعلقات عامہ کے شعبہ میں چلا گیا وہاں کرنل مجید ملک تھے' جی ایچ کیو میں فیض احمد فیض تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔ جو کلکتے میں رہے پھر سنگاپور گئے اور وہاں سے فوج کے تعلقات عامہ کا اخبار "جواب" نکالا۔ مجھے قاہرہ روانہ کیا گیا لیکن واپس آنا پڑا۔ کیونکہ مجھ قاہرہ آتے دیکھ کر ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ حکم ہوا سنگاپور جاؤ۔ ہم سنگاپور گئے۔ تین برس مشرق بعید میں رہے۔ وہاں مجھے ملایا' انڈونیشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کے ادب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ وہاں کے لوک گیت "جزیروں کے گیت" کے نام سے شائع ہوئے۔

یہ میری زندگی کا سنہرا دور تھا' جوان تھا' سب آسائشیں حاصل تھیں اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں نئی سوچ کے دروازے کھلے اور اس

حقیقت کا شعور حاصل ہوا کہ

"خدا کسی ملک کو فاتح قوموں کی آماجگاہ نہ بنائے"

اس زمانے میں ہی انڈین نیشنل آرمی کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے بہت سے نظریاتی اختلافات کے باوجود ہندوستان کی آزادی میں اس کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیادیں جن عوامل نے ہلا دیں ان میں انڈین نیشنل آرمی کا بھی بڑا حصہ ہے۔

"جب پاکستان بنا، تو ہم سنگاپور میں تھے"

زندگی ان گنت ناقابل فرموش واقعات سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اگر کوئی پوچھے کہ میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ کون سا ہے تو میں جواب دوں گا۔ میری زندگی کا سب سے اہم اور یادگار واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے باوردی کپتان کی حیثیت سے ملایا میں پاکستان کے پرچم کو پہلا سلیوٹ کیا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہماری قامتیں بلند ہو گئی ہیں۔ جیسے ہمارے BADGES واقعی ستاروں کی طرح چمکنے لگے ہیں۔

میں ایک اہم حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ حقیقت میرے مشاہدے میں آئی کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو برٹش انڈین آرمی میں مسلمان اور ہندو سپاہی میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ سب مسلمان سپاہی اور افسر پاکستان بننے سے پہلے ہی پاکستانی بن چکے تھے۔ ہمارے مسلمان افسروں اور ہندو افسروں میں گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ ایسے لمحے بھی آئے کہ کھانے کی میز پر چھری کانٹوں سے جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

ہم تو جلد از جلد اپنے پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن برطانیہ ہمیں بھیجنے میں تاخیر کر رہا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ بحری جہاز نہیں ہیں۔ بہرحال فروری ۱۹۴۸ء میں راچی سے پاکستان پہنچا۔ کراچی اس وقت پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ سپیشل ٹرین کے ذریعے راولپنڈی پہنچے کیونکہ جی ایچ کیو میں رپورٹ کرنی تھی۔ اس وقت جنرل ہیڈکوارٹر کا یہ عالم تھا کہ کرسیاں اور میزیں تانگوں میں ڈھوئی جا رہی تھیں۔ میں نے بریگیڈیئر کلو کو بے سروسامانی کے عالم میں برآمدے میں میز پر بیٹھے دیکھا اس کے باوجود سب خوش تھے۔ بے انتہا مسرور تھے۔ میری پوسٹنگ فرسٹ پنجاب جہلم میں ہوئی۔ یہاں کا کمانڈنٹ انگریز تھا۔ اور نمبر ٹو میجر (ریٹائرڈ) کے ایم اظہر تھے۔

"قدرت انسان کو بہت کچھ دیتی اور دکھاتی ہے۔ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم سے تین فرلانگ دور جہاں چھاؤنی شروع ہوتی، ایک آخری بنگلہ تھا جب سکول میں ریاضی کا پیریڈ ہوتا تو میں کسی دوست کے ساتھ "پھٹا" کھا کر وہاں آنکلتا اور ہم اس بنگلے کی دیوار پر بیٹھ جاتے۔ اس زمانے میں وہاں ایک انگریز کیپٹن رہتا تھا۔ ہم دیکھتے کہ ایک میم برآمدے میں بیٹھی ہے، جب کیپٹن آتا تو وہ ایک دوسرے کو Kiss کرتے پھر چائے پیتے۔ طالب علمی کے ان دنوں میں میں سوچا کرتا کیا کوئی ایسا وقت بھی آئے گا کہ میں بھی کسی ایسے بنگلے میں رہوں۔ میری تمنا تھی کہ زندگی میں ایسے بنگلے میں رہائش نصیب ہو۔ اس زمانے میں جہلم چھاؤنی میں عام آدمی کی گزر کم ہی ہوتی تھی۔ انگریز افسر رہتے تھے اور ان کی بڑی دہشت تھی

کئی برس بعد، پاکستان بننے پر جب میری تعیناتی جہلم میں ہوئی تو مجھے وہی سرکاری بنگلہ رہائش کے لئے الاٹ ہوا، جس کے خواب میں نے دیکھے تھے۔ جب اس بنگلے میں رہائش ملی تو دل نے کہا اگر ہم آزاد نہ ہوتے اگر پاکستان نہ بنتا تو پھر اس بنگلے میں، میں کبھی قدم نہیں دھر سکتا تھا۔

کشمیر کی جنگ آزادی شروع ہو چکی تھی۔ پنجاب رجمنٹ میں لیفٹ رائٹ کرتے پھر تعلقات عامہ کے شعبے میں واپسی ہوئی۔ آزاد کشمیر کی "لبریشن وار" میں شریک ہوا۔ میری تعیناتی مظفرآباد میں ہوئی۔ اس جہاد میں، میں دھویں اور آگ سے گزرا۔ اوڑی فرنٹ پر لڑا۔ لیجنڈری جنرل طارق کے ہیڈکوارٹر میں رہا۔

بلوچ رجمنٹ نے جب بلند ترین پہاڑی چوٹی پانڈو فتح کی تو یہ اعزاز مجھے نصیب ہوا کہ ساری دنیا کو یہ خبر میں، نے سنائی۔

بہت سے واقعات ہیں، جو دل کو ہمیشہ گرماتے رہتے ہیں۔ جب پانڈو فتح ہوئی تو کمانڈنٹ لیفٹننٹ کرنل شیر بہادر تھے۔ لڑائی کے بعد وہ میدان جنگ میں گھوم رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ آنسو بہا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا سر کیا ہوا؟؟ کہنے لگے۔

میرے کچھ سپاہی شہید ہو گئے ہیں۔ سوچتا ہوں میں نے اس راستے پر آنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ دوسرے راستے پر جانا چاہئے تھا۔

یہ احساس ذمہ داری SENSE OF RESPONSIBILITY تھی، جو انہیں آنسو بہانے پر مجبور کر رہی تھی۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کس قدر گراں ذمہ داری ہوتی ہے۔

زندگی کے سارے ہی رنگ ہیں۔ آدمی ہنستا بھی ہے اور روتا بھی

ہے- ایک دلچسپ واقعہ ہے- جنگ کشمیر کے دنوں میں جنرل نذیر احمد کمانڈنگ افسر تھے- میں نے انہیں آزردہ پایا تو پوچھا سر کیا خبر ہے محاذ سے- کہنے لگے- یار ہمارا سپہ سالار گریسی انگریزی میں جنگ لڑ رہا ہے اور ہم پنجابی میں لڑ رہے ہیں- میں ہنس دیا- مسئلہ انگریزی اور پنجابی زبانوں کی افہام و تفہیم کا بن گیا تھا- گریسی انگریزی میں بات کرتے اور جنرل نذیر احمد خان پنجابی میں.....

کشمیر کی جنگ میں کئی بار احساس ہوا کہ اپنی جنگ کیا ہوتی ہے- میں اگر کسی جنگ میں موت کے قریب پہنچا تو وہ کشمیر کی جنگ تھی- بہرحال موت آئی ہوتی تو مر بھی جاتا- دوسری جنگ عظیم میں تو ہم مجبوراً" لڑ رہے تھے- یہ فرق معلوم ہوا کہ اپنی جنگ اور بیگانی جنگ کیا ہوتی ہے-

کشمیر کی جنگ کے خاتمہ پر ۱۹۴۹ء میں میرے قلم کے اندر پھر کھجلی ہونے لگی- تلوار کی اہمیت کا تو میں قائل ہوں- آزادی اور سلامتی کے لئے تلوار کا سہارا لازمی ہوتا ہے لیکن میں تلوار کی آزادی کا حامی نہیں ہوں- میں سمجھتا ہوں کہ قلم کی طاقت بھی جنگ ختم کرنے کے لئے استعمال کرنی چاہئے+ جنگ کے لئے نہیں- قلم سے تو قومی نظمیں لکھنی چاہئیں' قوم کو گرمانا چاہئے' میرا علاقہ "ڈھول سپاہیوں کا علاقہ" ہے میں ان شاعروں میں سے ہوں جنہوں نے متحدہ ہندوستان میں بھی وطن کے ترانے لکھے تھے- پاکستان بننے کے بعد تو پھر لاوا ہی پھوٹ پڑا اور قومی شاعری میری شاعری کا اہم اور نمایاں حصہ بن گئی اور وطنی شاعری میں میری روح شامل ہے- پوری طرح ہم آہنگ ہے-

ہوا یوں کہ ملک سر فیروز خان نون اور خان بہادر احمد سعید نے اپنے اخبار "غالب" کی چیف ایڈیٹری کی پیش کش کی- میں نے یونیفارم اتاری- کمیشن سے استعفیٰ دیا' فوج سے ریلیف لے لی- اگر میں اس وقت فوج نہ چھوڑتا تو آج یقیناً" ریٹائرڈ جنرل ہوتا- اخبار کی چیف ایڈیٹری کے لئے لاہور آگیا- لیکن وہ اخبار نہ چل سکا- مجھے پالیسی کا اختیار دیا گیا تھا مگر اختلافات ہونے لگے- نون صاحب گورنر بن گئے اور اخبار میں ان کی دلچسپی ختم ہو گئی- خان بہادر احمد سعید پروگریسو آدمی تھے- یہ اخبار پانچ چھ ماہ ہی چلا' مال روڈ پر دفتر تھا- اس اخبار میں میرے ساتھ شوکت تھانوی' عبدالرحیم شبلی' افضل صدیقی (روزنامہ امن کراچی والے)' اختر عکسی کے علاوہ مولانا نصراللہ خان عزیز بھی تھے' جو اداریہ لکھا کرتے تھے-

"غالب" لاہور کا قصہ تمام ہوا تو ہم نے راولپنڈی سے بادشمال کے نام سے ایک اخبار نکالا- سنگاپور میں چراغ حسن حسرت اردو میں فوجی اخبار "جوان" نکالتے تھے- یہ پہلا اردو اخبار تھا جو مشرق بعید سے نکلا تھا- میں نے اس اخبار اور مولانا چراغ حسن حسرت سے بہت کچھ سیکھا تھا- اس کی Layout وہی تھی جو بعد میں "امروز" میں مولانا چراغ حسن حسرت نے سیٹ کی- روزنامہ "جوان" کے بارے میں دو ایک دلچسپ باتیں بتاتا ہوں- یہ اخبار لکھنؤ میں ایک چینی چھاپے خانے میں چھپتا تھا- جنہیں اردو کا ایک حرف نہ آتا تھا- مگر چینی سنگاز ایسے باکمال تھے کہ مجال ہے کہ کوئی نقطہ' کشش یا جوڑ ٹوٹ جائے- بہرحال بادشمال کے منصوبے میں کئی دوست شامل ہوئے پیسے جمع کئے گئے اسی نوے ہزار روپے جمع ہوئے' جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی- بہرحال اخبار نکلا' جو کاغذوں میں تو چل نکلا لیکن حقیقی معنوں میں چل نہ سکا- اشتہار بھی خاصے ملتے تھے ہم خود کفیل بھی ہو سکتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اشتہاروں کی فوری ادائیگی نہ ہوتی تھی محفوظ سرمایہ ہمارے پاس تھا نہیں- بنکوں سے یا کسی اور سے قرضہ لینے کے بارے میں ذہن نے سوچا تک نہیں- تعمیر اور بادشمال اس علاقے میں تقریباً ایک ساتھ ہی نکلے تھے-

کچھ خامیاں منصوبہ بندی میں ہوئیں ڈیکلریشن ملنے میں خاصی دیر ہو گئی- چوہدری محمد حسین پریس برانچ کے انچارج تھے انہوں نے کہا تھا بس جلد ہی ڈیکلریشن مل جائے گا مگر ایسا نہ ہوا ادھر ہم نے عملہ بھرتی کر لیا کاتب حضرات کو لاہور سے راولپنڈی لے آئے اخبار کا ڈیکلریشن ملنے میں تاخیر ہوئی اور خوش نویس حضرات اور دوسرے سٹاف کا خرچہ پڑتا رہا- بہرحال یہ اخبار چل نہ سکا- حالانکہ یہ لے آؤٹ اور کئی لحاظ سے ایک بہتر اخبار تھا- ہاں ایک بات اور اخبار کے نام "باد شمال" کو اکثریت نے ناپسند کیا یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اس کا نام اخباروں جیسا نہیں ہے- لیکن ایک آدمی ایسا تھا' جس نے اس نام کو بے حد پسند کیا اور وہ تھے شیخ سر عبدالقادر..... اس لئے کسی اعتراض کو دل پر نہ لگایا کہ شیخ سر عبدالقادر نے یہ نام پسند کیا تھا-

اخبار بند کرنا پڑا- اس اخبار کی وجہ سے ہماری معیشت بہت مضطرب ہوئی میری جو زمین تھی وہ ہاتھ سے نکل گئی..... میں پھر اپنے گاؤں میں آگیا-

چھوٹی موٹی اور مقامی سیاست میں ہمارے خاندان کا اثر و رسوخ مسلم تھا- اگرچہ ہم خود اسمبلی میں نہ جا سکتے تھے لیکن ہماری مدد کے بغیر

کوئی دوسرا بھی اسمبلی میں نہ جاسکتا تھا۔ جانے جی میں کیا آئی کہ ہم ۱۹۵۱ء کے عام انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے میدان میں آگئے۔ ہمارا مخالف مسلم لیگ کا ایک امیر آدمی تھا۔

چالیس برس پہلے کے یہ الیکشن آج کے الیکشنوں سے بالکل مختلف تھے۔ مخالف امیدوار سے ہمارے مجلسی روابط تھے وہ علاقے کا ہی آدمی تھا اگرچہ وہ امیر تھا لیکن ہماری عزت بھی لوگوں کے دلوں میں تھی' وہ بھی ہمارا احترام کرتا تھا۔ دینہ میں ہمارے اور ان کے انتخابی کیمپ آمنے سامنے تھے۔ ہمارے کئی ووٹروں نے اس پر اعتراض کیا کہ ہم تو آپ کو کامیاب کرانے کے لئے جان کیبازی لگائے ہوئے ہیں اور آپ ہیں کے اسے اپنے کیمپ میں آنے دیتے ہیں اور خود اس کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے ہم اس پر متفق نہ ہوئے۔ آخر اتفاق ہوا تو ہم دونوں امیدواروں میں اس بات پر کہ وہ اپنی کنویسنگ کے لئے ہمارے گاؤں میں نہیں آئیں گے اور ہم اپنی کنویسنگ کے لئے ان کے گاؤں میں نہیں جائیں گے۔ ہمارے اور ہمارے مخالف امیدوار کے گاؤں میں پولنگ سٹیشن بھی بنے۔ طے پایا کہ اپنے گاؤں میں وہ میرے آدمیوں کے لئے کھانے کا انتظام کرے گا اور میں اپنے گاؤں میں اس کے پولنگ سٹیشن پر بیٹھنے والے اس کے کارکنوں کے کھانے پینے کا ذمہ دار ہوں گا ور ایسا ہی ہوا۔ یہ جو انتخابات ہیں پولرائزیشن آئی ہے یہ اس وقت نہیں تھی۔ سماجی تعلقات کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اب تو روایات ہی بدل گئی ہیں۔ بہرحال انتخابات ہم ہار گئے۔ لیکن اچھی روایت بھی قائم کی۔

باد شمال کی ناکامی اور انتخابات کی شکست کے بعد ہم پھر فوج میں نئے سرے سے آگئے اور پھر ۱۹۶۶ء تک وردی میں رہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں تعلقات عامہ کے شعبے سے وابستگی کی بناء پر سیالکوٹ کے محاذ پر رہا۔ جنگ میں حصہ بھی لیا اور جنگ کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں فوج اور پاکستانی عوام نے جس عدیم النظیر جذبے کا اظہار کیا وہ ہماری تاریخ کی قیمتی متاع ہے میں اپنے مشاہدات کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس جنگ میں جو منظر دیکھنے میں آئے وہ کتابوں میں تو ضرور پڑھے تھے لیکن کبھی دیکھے نہیں۔ جب عوامی طاقت بھی فوج کے ساتھ شامل ہو جائے تو پھر کم وسائل کے باوجود فوج ایسے کارنامے انجام دیتی ہے جو معجزوں سے کم نہیں ہوتے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ایسا ہی ہوا۔ ایک بڑا سپہ سالار جسے عوامی مقبولیت بھی حاصل ہو وہ کم تعداد اور کم وسائل کے ساتھ جنگ کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جنگ کو نیا اسلوب دے کر مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ شجاعت اور بہادری کی نئی روایتیں اور نئی مثالیں قائم کرتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ایسا ہی ہوا۔

اگر معروضی تجزیہ کروں تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت دونوں طرف جو عسکری قیادت تھی وہ زیادہ تجربہ کار نہیں تھی۔ وہی لوگ تھے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں کمپنیاں کمانڈ کی تھیں لیکن وہ بہت بڑی جنگ تھی۔ یہاں جب وہ ایک دوسرے کے سامنے آئے تو ایک جیسے تھے۔ لیکن ہماری فوج نے اپنے وطن کی سلامتی اور آزادی کے لئے بڑے سے بڑا رسک لیا۔

ایک ترکیب عموماً استعمال کی جاتی ہے "پروانہ وار" ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میں نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو پروانہ وار موت کی طرف بڑھتے دیکھا۔ تنگ پتلونوں والے نوجوان فوجی افسر جو کالجوں سے نکل کر فوج میں آئے تھے جن کے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی تھی جس جذبے سے وہ لڑے' جانیں قربان کیں اور موت کا سامنا کیا' ہماری قوم کو ان پر فخر کرنا چاہئے۔

ہماری فوج کا ایک میجر تھا' جو میدان کارزار میں اور ہروقت اپنے ساتھ پاکستان کا پرچم رکھتا تھا میں نے اس پر نظم بھی لکھی تھی۔ وہ کہتا تھا گر میں مرجاؤں تو اس پرچم میں دفنایا جائے اگر میں فاتح ہوا تو اس پرچم کو لہراؤں گا.... ایک شاعر' ایک ادیب ایک امن پسند شہری کے حوالے سے میں جنگ کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑا دشمن بھارت ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے۔ جو امن قائم ہونے نہیں دیتا۔

۱۹۶۶ء میں میجر کے رینک پر ریٹائر ہوا اور اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے کے شعبہ تعلقات عامہ کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا اس سے پہلے بھی میں ڈیپوٹیشن پر ترقیاتی ادارے میں آچکا تھا میں نے اس شہر اس دارالحکومت کو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھا۔ پہلی اینٹ رکھنے سے آباد ہونے تک.... اسلام آباد میرے سامنے بنا۔ اسلام آباد کے علاقوں کے نام میرے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ "آب پارہ' رمنا سب میرے رکھے ہوئے نام ہیں۔ اسلام آباد خوبصورت شہر ہے۔ لیکن یہ شہر اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ملک کی غربت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس شہر کی تعمیر.... مشرقی پاکستان کی خفگی کا باعث بھی بنی۔ ہم شہر بنانے والوں سے

گزارشات کرتے رہے کہ اس کے ماسٹرپلان میں آٹھ آٹھ نو نو کنال کے پلاٹ کیوں رکھے گئے ہیں چھوٹے چھوٹے پلاٹ بھی رکھیں۔ تاکہ متوسط طبقے کے لوگ بھی یہاں آسکیں۔ میرے خیال میں تو دس بارہ مرلے سے بڑا کوئی پلاٹ اسلام آباد میں ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔ تب ہمیں دلائل دیئے جاتے تھے کہ ہم نے اس شہر کو تجارتی شہر نہیں بنانا ہے۔ جب کہ اب اسلام آباد ایک بڑا تجارتی شہر بن چکا ہے۔ جہاں ہر چیز نیلام ہوتی ہے۔ یہاں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو پورے پاکستان کو خرید سکتے ہیں۔

بہرحال اس شہر اسلام آباد کی اپنی نفسیات ہے' اپنی اہمیت ہے اور تاریخی اہمیت بھی بن رہی ہے وہ شہر جو کبھی تصور میں تھا اب ایک زندہ حقیقت بن چکا ہے۔

میں وزارت اطلاعات میں نیشنل سنٹر کے شعبے میں بھی ڈائریکٹر رہا۔ پیر علی محمد راشدی ہمارے چیئرمین تھے۔ نیشنل سنٹر کی افادیت کے حوالے سے میں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں برابر یہ اصرار کیا کہ اسے ذرائع ابلاغ اور جلسوں کا وسیلہ نہ بنایا جائے اسے حکومت کا آلہ کار نہیں بنانا چاہئے۔ ہمارے ہاں ابھی تک یہ روایت نہیں بن سکی کہ کوئی سرکاری ادارہ اپوزیشن سے بھی ہم آہنگ ہو سکے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ نیشنل سنٹر کو لائبریوں کی حد تک محدود کر دیا جائے' یہاں طلباء کے نصاب کی کتابیں رکھی جائیں۔ حوالے اور ریفرنس کی کتابیں ہوں۔ افسوس کہ ہمارے ہاں سمت ہی غلط متعین کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ادارے بنانے بھی مشکل ہیں اور انہیں توڑنا بھی بہت مشکل...

نیشنل سنٹر کی ملازمت کے بعد دو سال ایسے بھی آئے جب بے کار رہا۔ پھر وزارت شمالی علاقہ جات میں مشیر تعلقات عامہ کے عہدے پر دو برس تک کام کیا۔ یوں افغان مہاجرین سے براہ راست تعلق قائم ہوا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا تجربہ ثابت ہوا۔ افغان مہاجرین کی دیکھ بھال ہماری ذمے داری تھی۔ یوں ان کے جذبے کی آنچ کو بھی قریب سے محسوس کرنے کا موقع ملا۔ افغان مہاجروں میں سے کسی نے مجھے یہ نہ کہا کہ وہ واپس نہیں جائے گا۔ سب اپنے وطن واپس جانے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ وہ زیادہ تر سرحدوں کے قریب رہنا پسند کرتے تھے تاکہ جلد اپنے وطن واپس جاسکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ افغان مہاجرین کی وجہ سے پاکستان کئی مسائل سے دوچار ہوا۔ ان کی وجہ سے کئی سماجی اور اقتصادی مسائل بھی پیدا ہوئے۔ بعض افغان مہاجرین نے فائدے بھی بہت اٹھائے لیکن میں نے کچھ ایسے مناظر بھی دیکھے جو بہت تکلیف دہ ہیں۔

پشاور کے ناصرباغ کیمپ میں میں نے ایک بہت معمولی اور چھوٹے سے خیمے میں افغانستان کے ایک سابق وزیراعظم آقائے شفیق کی بیوہ کو انتہائی کسمپرسی کے عالم میں رہتے دیکھا۔

ایک اور واقعہ بھی ہے... جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی ایک ادبی اہمیت بھی ہے۔ بلوچستان میں میں افغان مہاجرین کے ایک خیمہ کیمپ میں گیا۔ وہ لوگ خیموں میں رہنا تکلیف دہ بتاتے تھے۔ میں نے انہیں طفل تسلی دینے کے لئے تقریر جھاڑ دی کہ پہلے لوگ تو خیموں میں ہی رہنا پسند کرتے تھے ان کے آباؤاجداد بھی خیموں کو ترجیح دیتے تھے۔ میں نے ظہیر الدین بابر کی بھی مثال دی کہ وہ خیمے میں رہتا تھا۔ وہاں ایک چودہ پندرہ برس کا افغان لڑکا تھا۔ اس نے برجستہ کہا۔

"آقائے من کجا خیمہ شاہی کجا خیمہ راہی"

میرے محترم کہاں شاہی خیمہ اور کہاں مسافر کا خیمہ

میں تو ہل کر رہ گیا' لاجواب ہو گیا۔ اس جواب میں جو صداقت ہے اسے جس شعری پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اس نے مجھے افغان لڑکے کی ذہانت سے بھی بے حد متاثر کیا۔

میں اکادمی ادبیات سے بھی وابستہ رہا ہوں۔ جب اکادمی نے اپنا رسالہ "ادبیات" نکالنے کا فیصلہ کیا تو میری خدمات حاصل کیں۔ پروفیسر پریشان خٹک چیئرمین تھے اور غلام ساقی آگرو' ڈائریکٹر جنرل بعد میں جناب شفیق الرحمٰن بھی اکادمی کے چیئرمین رہے.. وہ اتنے بڑے ادیب ہیں کہ کسی اکادمی کے لئے یہ اعزاز تھا کہ وہ اس کے چیئرمین تھے۔ ایسے شخص کی موجودگی کسی ادارے کو زیارت گاہ بنا دیتی ہے۔

اکادمی ادبیات کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک اکادمی اپنی سمت متعین نہیں کر سکی۔ اکادمی کو زیادہ ٹھوس علمی کام کرنا چاہئے۔ اسے ایسی کتابیں شائع کرنی چاہیں جنہیں عام ناشر شائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ پھر اہل قلم کا تبادلہ صرف چین سے ہو رہا ہے۔ جب کہ دنیا کے دیگر ملکوں اور بالخصوص اسلامی ملکوں کے ساتھ ہمارا ادبی رابطہ زیادہ گہرا اور مستحکم ہونا چاہئے۔ اکادمی کے ذریعے ہم اپنی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو پھیلا سکتے ہیں۔

کاش..... میری دعا ہے کہ اس ملک میں اہل قلم کو سرکاری سرپرستی کی احتیاج نہ رہے۔

اہل قلم کے رابطے کو مرکز میں ایک ادبی اجتماع کی صورت میں قائم کرنے کی بجائے ملک کے دوسرے حصوں میں اس قسم کے اجتماعات کا

اہتمام ہونا چاہئے۔ ویسے اہل قلم کی ایک بڑی تعداد کو ایک جگہ پر جمع کرنے میں کئی انتظامی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اہل قلم کی شکایات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

ویسے بھی اہل قلم کانفرنس کی اہمیت ہی کیا رہ گئی ہے۔ بے نظیر وزیراعظم تھیں تو ان کے پاس اہل قلم کانفرنس کے لئے وقت نہیں تھا اور اب وزیراعظم نواز شریف کے پاس بھی وقت نہیں....

میں اپنے خدا کا بے حد شکرگزار ہوں، جتنا شکر کروں کم ہے۔ اس نے مجھے عزت دی، مجھے صلاحیتوں سے نوازا، سنجیدہ شعر کہے، مزاحیہ بھی، ہلکے پھلکے مضامین خاکے اور صحافتی کالم بھی لکھے۔

اسلام آباد ٹیلی ویژن سے ایک باقاعدہ پروگرام آپ کا ضمیر کے نام سے بھی کیا اور وہ پروگرام بہت کامیاب رہا۔ محبتوں نے زندہ رکھا۔ محبتوں نے سارے کام سنوارے۔

بس اب چلے جا رہے ہیں مقصد تو کبھی کہیں پہنچنا نہیں تھا۔

○☆○

صبیحہ جعفری دختر ادا جعفری کی شادی کی تقریب پر منصور تابش، اصغر بٹ، آغا بابر اور احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ ۱۹۷۳ء

گلزار جاوید

"چہار سو" زندگی کے پانچویں سال میں داخل ہو گیا اور یہ پانچوں سال اس کوشش میں گزرے کہ ہم اپنے ادبی پیرومرشد سید ضمیر جعفری کے فن و شخصیت کو اُن خراج پیش کریں مگر ہماری خواہش کے آگے ان کی اُستادانہ "نا" کا ہمیشہ ایک عذر رہا کہ میں جس جریدہ کا مدیر اعلٰی ہوں اس میں میری مدح سرائی قطعی نہ ہو گی۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ استاد محترم راولپنڈی اسلام کو خیر آباد کہتے ہوئے گوجرانوالہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ہمارے ساتھی برادرم انعام الحق جاوید کا اصرار اور ڈاکٹر احسان احمد شیخ کی جرنیلی ضد نے ہمیں سرخرو ہونے کا نادر موقع فراہم کر دیا۔ زیرنظر شمارہ عجلت میں پیش ہونے کے باعث استاد محترم کی قدربانی کے لحاظ سے قطعی ناکافی ہے۔ دعا کیجئے کہ رب کریم ہمیں ایسی بہت سی کوششوں کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

○ شاعری کی طرف رجحان کے اسباب؟

☆ مجھے نہیں معلوم۔ ہمارے خاندان میں درویشی تو رہی، مگر شاعری کا گزر نہیں ہوا۔ البتہ ننھیال میں میرے پڑنانا سلطان العارفین پیر محمد شاہ پنجابی کے مقبول صوفی شاعر تھے، جن کے ابیات گزشتہ دو صدیوں سے سینہ بہ سینہ آزاد کشمیر اور پوٹھوار کے علاقوں میں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ یہ عارفانہ ابیات گھروں میں پڑھے سنے جاتے ہیں۔ دینی مجالس میں بھی واعظین کی زبانوں پر رہتے ہیں اور عوامی میلوں میں بھی لوک فن کار، جن میں عالم لوہار بہت نمایاں تھے، اکتارے اور چمٹے کے ساتھ گاتے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی ہیر رانجھے کی سہ حرفی جو "پیردی ہیر" کے نام سے گزشتہ صدی میں شائع ہوئی تھی، ان علاقوں میں بے حد مقبول ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پیردی ہیر" ان علاقوں میں ہیر وارث شاہ سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی وجہ شاید مقامی پوٹھوہاری لہجے کی مانوس مٹھاس ہے۔ سید محمد شاہ کے ابیات کا ایک مجموعہ مرکزی حکومت کے لوک ورثے کے ادارے کی طرف سے "من کے تار" کے عنوان سے چند برس قبل شائع ہو چکا ہے۔ پیر سید محمد شاہ ضلع میرپور آزاد کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں کھنیارہ شریف میں پیدا ہوئے۔

ایک دوسرا موروثی محرک میرے والد صاحب قبلہ سید حیدر شاہ کا ذوق مطالعہ ہے۔ گاؤں میں بھی انہوں نے اخبار لگوا رکھا تھا اور چند مذہبی نوعیت کے رسائل و جرائد بھی باقاعدگی سے منگوایا کرتے۔ میلاد کی مجلسوں میں بھی میں ذوق و شوق سے شامل ہوتا اور علاقے میں دور دور تک جہاں کہیں کسی میلے مجرے کی بھنک پڑتی میں ضرور پہنچتا۔ گاؤں کے پرائمری اسکول میں ایک باذوق استاد نے بھی شاید اس چنگاری کو روشن کیا ہو۔ ان کا نام نور حسین وفا تھا۔ منشی فاضل، قلندروں کی طرح زلفیں رکھتے اور کلائی میں گجرے پہنتے۔

○ ابتداء میں سنجیدہ شعر کہے یا مزاحیہ؟

☆ ابتدا سنجیدہ شعر ہی سے ہوئی

○ مزاحیہ شاعری کب اور کس تحریک پر شروع کی؟

☆ ہائی کلاسوں میں آکر مزاحیہ شاعری کا آغاز ہوا۔ طبیعت کا میلان شروع سے ظرافت کی طرف تھا۔ اسکول کے ماحول نے اس حس کو جلدی ہی گدگدا دیا۔ مزاحیہ اشعار کی بدولت اسکول میں جو قبولیت اور اہمیت ملی اس نے بھی اس رغبت کو تقویت دی۔

○ آپ کی سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں شاعری توجہ کی طالب ہیں مگر فوقیت کسے حاصل ہے؟

☆ سنجیدہ کو۔ اس لئے کہ میں تو مزاحیہ شاعری کو سنجیدہ ہی سمجھتا ہوں۔ اس کی بنیاد بھی تو آنسوؤں ہی پر ہے۔ یہ مسکراتے ہوئے آنسو ہیں۔

○ آپ کے دور کے بڑے شاعر؟

☆ بڑا یا عظیم شاعر تو اقبال ہی پیدا ہوا۔ البتہ منفرد اسلوب کے حامل اہم شعراء بہت سے ہیں۔ جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ حسرت موہانی، جوش، فراق، حفیظ، فانی، جگر، فیض، ندیم، قتیل، مجاز، اختر الایمان، احسان دانش، اختر شیرانی، ن۔م۔راشد، کن کن کے نام لوں اور کتنے نام لوں۔

○ غزل کے بارے میں مختلف دور میں مختلف آراء سامنے آتی رہیں آپ کی رائے بھی ہمارے لئے اہم ہوگی۔

☆ غزل میرے نزدیک شاعری کی محبوب ترین صنف ہے۔ یہ فرد اور عہد دونوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس کے امکانات بے اندازہ ہیں۔

○ کیا آپ ان اساتذہ کے اسمائے گرامی بتانا پسند کریں گے جن سے آپ متاثر ہوئے یا فیض حاصل کیا؟

☆ لفظ و آہنگ کا ایک سیلاب ہے جس کو میں شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی روح میں جذب کرتا رہا ہوں۔ غالب و اقبال کے بعد حفیظ اور جوش میرے دور کی اہم آوازوں میں سے تھیں۔ ذاتی طور پر میں اختر شیرانی کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوا۔

○ آپ کے خیال میں اردو ادب میں مزاحیہ شاعری کا کوئی مقام ہے اگر نہیں تو کب تک ہوگا؟

☆ مزاحیہ شاعری کو ہمارے ادب میں وہ مقام ابھی تک نہیں ملا جو اس کا حق تھا۔ کچھ قصور نقادوں کا بھی ہے اور کچھ قصور خود مزاح گو شعراء کا بھی ہے۔ اکبر کے بعد شاید ہی کوئی شاعر ہوا ہے جس نے اکبر کی طرح مزاحیہ شاعری کو سنجیدگی سے اختیار کیا ہو۔ نقادوں کا ذہن بھی مزاحیہ شاعری کے خدوخال، مطالبات اور معیار کے بارے میں کچھ ایسا صاف نہیں ہے۔ ہزل اور مسخرگی نے بھی کافی دھند پھیلا رکھی ہے۔ جو چھٹتے چھٹتے ہی چھٹے گی۔ بہرحال اس میں کیا شک ہے کہ مزاح زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔

○ آزاد شاعری کے بارے میں آپ کی رائے؟

☆ میں تجربے کا حامی ہوں۔ تازہ ہوا کے بغیر ادب بھی پودے کی طرح سوکھ جاتا ہے۔ آزاد شاعری نے اپنی اہمیت کو منوا لیا ہے۔

○ عالمی ادب میں اردو ادب کا کوئی مقام ہے اگر ہے تو کس حد تک؟

☆ عالمی ادب پر میری اتنی نگاہ نہیں ہے کہ میں کوئی تقابلی اندازہ پیش کر سکوں۔ مگر اپنی معلومات کی حد تک میرا یہ احساس ہے کہ جس زبان میں میر و غالب اور اقبال جیسے شاعر ہوں اسے کسی اعتبار سے بھی کم مایہ نہیں کہا جا سکتا اور اردو کی جدید شاعری جس کی نمائندگی فیض، راشد اور ندیم کرتے ہیں کسی ملک کی شاعری سے کمتر نہیں۔

○ علاقائی ادب کے پنپنے کے کتنے فیصد چانس ہیں کیا انہیں اردو ادب میں شامل ہو کر اپنا مقام حاصل کرنا چاہئے یا اپنی حیثیت میں اپنا آپ منوانا چاہئے؟

☆ علاقائی ادب اپنی الگ شناخت پیدا کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پاکستان میں علاقائی زبانیں اور قومی زبان کے باہمی لین دین سے یہ بُعد کم ہوتا جائے گا۔ کسی آزاد مملکت میں علاقائی ادب کی نشوونما کو روکا جا ہی نہیں سکتا۔ ایسا کرنا، دریا کے دھارے کے خلاف تیرنے کے مترادف ہے۔

○ ہماری شاعری موسیقی کی محتاج ہے یا موسیقی شاعری کی؟

☆ شاعری اور موسیقی جڑواں بہنیں ہیں

○ آپ نے تحقیقی کام کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی کیوں؟

☆ تخلیقی کام ہی کو پوری محبت کہاں دے سکا ہوں کہ تحقیقی کام کی طرف متوجہ ہوتا۔ یوں تو...... ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

○ ملک کے بیشتر مزاح نگاروں کا تعلق پاک فوج سے رہا ہے آپ کے خیال میں اس کی کوئی خاص وجہ؟

☆ عسکری زندگی میں رفاقت، مشقت اور خطرات کے عوامل ظرافت کی حس کی آبیاری کرتے ہیں۔

○ ادب کے حوالے سے لاہور اور کراچی سرفہرست ہیں آپ نے اسلام آباد جیسے خاموش شہر کو کیوں مسکن بنائے رکھا اس بارے میں کچھ روشنی ڈالیں گے؟

☆ کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

○ اور آپ اب اس محبت کی تازہ بستی کو چھوڑے جا رہے ہیں۔ ہمارے احساسات تو آپ جانتے ہیں اپنی حالت کے بارے میں بھی کچھ فرمایئے۔؟

☆ جس سوال سے میں بچنا چاہتا تھا وہی سوال تم نے داغ دیا۔ بھئی وجوہات تو بے شمار ہیں مگر میں اپنی آزردگی میں اپنے قاری کو شریک کر کے بوجھل نہیں کرنا چاہتا بیٹا بہو پوتے پوتیاں کے اصرار پر زندگی کے بقیہ دن ان کے ساتھ شیئر کرنے جا رہا ہوں اس انتقال مکانی پر کبھی کبھی دل بھی ہولتا ہے کہ لوگ مجھے اکثر راولپنڈی اسلام آباد کے ادب کی گھنی چھاں سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور میں ان کے سروں سے یہ سایہ کیوں کھینچ رہا ہوں مگر جب میری نگاہ اپنے نوجوان ساتھیوں اور دوستوں پر پڑتی ہے تو دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ افتخار عارف، انور مسعود، غلام ربانی آگرو، سرفراز شاہد، انعام الحق جاوید، سلطان رشک، گلزار جاوید اور خالد محمود عارف کی شکل میں میری مضبوط جڑیں یہاں موجود ہیں۔ پہلے میں اسلام آباد میں رہتے ہوئے دوسرے شہروں میں رہا کرتا تھا اب دوسرے شہروں میں رہتے ہوئے وقت زیادہ اسلام آباد میں گزرے گا۔ انشاء اللہ

○ محبت کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا، ذاتی تجربہ بھی بیان کریں تو نوازش ہو گی؟

☆ محبت کے مظاہر بے شمار ہیں لیکن ایک بات یہ ہے کہ محبت کے بغیر انسان ادھورا اور زندگی بے معنی ہے۔ حسن انسانی میرے جسم و جاں میں زلزلے تو اکثر برپا کرتا رہا مگر موروثی قناعت، بے نیازی اور روایات کی پاسداری کی برکت یا عادت یا جبر کے باعث کوئی جھٹکا ہمیں پاگل پن کی حد تک متزلزل نہ کر سکا۔ بقول اقبال۔

حسن نسوانی ہے بجلی میری فطرت کے لئے
پھر تعجب ہے کہ میرا عشق بے پروا بھی ہے

میں شاید اتنا مصروف رہا کہ مجھے کسی سے عشق کرنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ عشق میرے لئے فرض زندگی تو تھا طرز زندگی نہ بن سکا۔ لیکن اگر کوئی ہمیں ہرجائی سمجھے تو اس سے خدا سمجھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے عشق اور ہوس کو الگ الگ برتنے کی مہلت ہی نہیں ملی یا شاید ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ زندگی کا ہمیشہ دونوں ہاتھ پھیلا کر سواگت کیا ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

جو بھی عورت ہے، خوبصورت ہے
یہ میری روح کی ضرورت ہے

○ ملک کے کئی جرائد کی مجلس ادارت میں آپ کا نام ہی نظر آتا ہے

آپ نے اپنا کوئی پرچہ نکالنے کی ضرورت محسوس کیوں نہ کی؟

☆ ذاتی مکان تک نہیں بنوایا۔ جریدہ کیا نکالتے۔ ہاں سفر کرنا اچھا لگا۔ مگر یہ پتھر ہم نے چومے بغیر نہیں چھوڑا۔ ۱۹۴۹ء میں راولپنڈی سے "بادشمال" کے نام سے ایک ذاتی قومی روزنامہ جاری کیا تھا جو ایک ہی برس چل کر رک گیا۔ کرنل محمد خان، ڈاکٹر صفدر محمود اور سلطان رشک کی شرکت سے طنز و مزاح کے لئے وقفت سہ ماہی "اردو پنچ" کی بنیاد بھی ہمیں نے رکھی۔ جس کو اب سلطان رشک چلا رہے ہیں۔ اور کیا "چہارسو" میرا اپنا نہیں ہے۔

○ سنا ہے آپ نے عمر عزیز کی کچھ ساعتیں سیاست کی خارزار میں

مسٹر اینڈ مسز جعفری بڑے صاحبزادے بریگیڈیر احتشام کی فیملی کے ہمراہ

گزاری ہیں۔ کنارہ کشی کی وجہ ذاتی تھی یا نظریاتی؟

☆ سیاست..... ۱۹۴۹ء میں فوج کی کپتانی سے استعفیٰ دے کر ہم نے پہلے راولپنڈی سے اخبار نکالا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں تحصیل جہلم کے دیہاتی حلقے سے اسمبلی کا الیکشن ہارا۔ جس کے بعد ہمت ہی ہار بیٹھے کہ سیاست پیسے کا کھیل بن گئی۔ ہم سیاست میں حادثاتی طور پر آئے اور سانحاتی طور پر نکل گئے۔ یوں اپنا ذاتی نظریہ جو آگے چل کر مستحکم ہوا یہ ہے کہ ادیب و شاعر کو سیاست میں تو ہونا چاہئے مگر کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہونا چاہئے۔ میرا ایک شعر شاید میرے اس احساس کی ترجمانی کر سکے۔

تھا فیصلہ غلط کہ نہایت غلط، مگر
بندے علی نے ووٹ دیا پارٹی کے ساتھ

○ آپ کے خیال میں پاکستانی ادب صحیح سمت میں سفر کر رہا ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

☆ ادب کبھی سیدھی لکیر میں نہیں چلتا یہ پانی کی طرح اپنی سمت خود مقرر کرتا ہے۔ پاکستانی ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ادب کے دھارے کو نہ روکا جاسکتا ہے اور نہ روکنا چاہئے۔ آپ ادب کے مستقبل کی بات پوچھتے ہیں میرا خیال تو یہ ہے کہ پاکستان کا مستقبل وہی ہو گا جو اس کا ادب بنائے گا۔

○ موجودہ قومی دھارے میں ادیب یا شاعر کا کوئی رول ہے اگر ہے تو یہ لوگ اپنا کردار احسن طریقہ سے ادا کر رہے ہیں؟

☆ پاکستان کا ادیب معاشرے کی بے پناہ ترغیبات..... تخفیفات..... اور دیگر لغویات کے دباؤ کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ایک بہتر اور خوش تر زندگی کی جنگ بے جگری کے ساتھ لڑ رہا ہے۔

○ نوجوان اہل قلم کے لئے کامیابی کا راز بتایئے؟

☆ میرے نزدیک زندگی کی کامیابی کے چار عناصر ہیں۔ خوش قسمتی، ذہانت، محنت اور محبت

○☆○☆

ضمیر جعفری رس بھرے الفاظ کا بادشاہ

ڈاکٹر سید عبداللہ

وادی جہلم کو سلام جس سے نامور تلوار کے دھنی بڑی کثیر تعداد میں ابھرے۔ مگر اتنی ہی کثرت سے قلم کے نامور دھنی (داعی) بھی اٹھے اور ان کی قطار لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں ایک سپاہی (کرنیل) ضمیر جعفری بھی ہے۔ اور میری بے خبری اور غفلت شعاری ملاحظہ ہو کہ میں خاصی مدت تک اسے لاہور کے سید محمد جعفری مرحوم کا بھائی خیال کرتا رہا.... اور اس سے زیادہ گنہگار کرنے والی لاعلمی یہ کہ میری نظر میں وہ ایک سپاہی تھا جو غم غلط کرنے کے لئے شوخیاں شرارتیں کر کے' دور افتادہ اور پیش پا افتادہ دوستوں یاروں کا دل بہلانے کے لئے صرف مزاحیہ شاعری میں نامور تھا اور اس کے علاوہ وہ اگر کچھ تھا تو صرف یہ کہ وہ ایک مشفق انسان ہے اور جس زمانے میں' میں نے اسے قریب سے دیکھا اس میں کہا جاتا تھا کہ وہ سی ڈی اے (ترقیاتی محکمہ اسلام آباد) کا ایک نیک نام اور نیک اندیش منتظم ہے جس کے حسن انتظام کا ایک کانفرنس کے سلسلے میں' میں نے خود بھی مشاہدہ کیا اور ہاں اس کے کچھ ملی ترانے بھی سن رکھے تھے جو بہت اچھے لگے تھے..... اور میری یہ عادت ہے کہ جو شاعری میرے دل پر قبضہ کر لیتی ہے وہ اکثر یاد رہتی ہے چنانچہ یہ ترانے اب بھی یاد ہیں۔

رفتہ رفتہ میری غلط فہمیاں دور ہوتی گئیں اور خوش فہمیاں (یعنی درست فہمیاں) زیادہ ہوتی گئیں اور یہ واقعہ یوں پیش آیا کہ مجھے ایک مرتبہ اس حقیقت کے انکشاف کی جستجو ہوئی کہ فوجی حضرات جو ادب میں بھی نام پیدا کرتے ہیں وہ حرب و ضرب جیسی فضا میں شعر و سخن کے گل پھول لگاتے ہیں اور اپنے خالص ادیب ہم عصروں میں بھی گردن اونچی کر کے چلتے ہیں' یہ نفسیات کے کن احوال و مقامات کا نتیجہ ہے میں مورخ اور عام نثر نگار فوجیوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ ایسی کرخت مخلوق جس کی مٹی آتش و آہن سے ترکیب پذیر ہوتی ہے۔ ان کے اوقات روز و شب میں سوسن کے پھول کن لمحات کا عطیہ ہوتے ہیں جس میں ان کا رنگ طبعیت غالب کے اس شعر کو عملی پیکر عطا کرتا ہے۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
مگر مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کا

اور یہ حقیقت ہے کہ حرب و ضرب کے دھماکوں اور تیغ و تفنگ کی صاعقہ ریزی اور آتش افگنی کے دوران شعر و شاعری کے حریر و پرنیاں کو نہ صرف بچا کر لے جانا بلکہ انہی لمحات میں حریر و پرنیاں کی صناعانہ تخلیق تجربہ فطرت سے کم نہیں مگر فوجی ادیبوں کے سینے اگر مقدس تشبیہ ہوں تو ان احجار (چٹانوں) کی مثل ہوتے ہیں جن کے اندر سے پانی کے چشمے (اور نہریں) ابل ابل کر گرد و پیش کو سیراب و شاداب کرتے رہتے ہیں۔

(یتفجر منہا الانہار)

اور راز یہ کھلا کہ یہ سب کچھ قانون اضداد کے تحت ہوتا ہے۔ ایک فوجی سے زیادہ زندگی کے تقابلات کا اندازہ شاید ہی کسی اور کو ہوتا ہو گا لیکن اس کے لئے اس روئی کی ضرورت ہوتی ہے جو زخموں پر رکھی جاتی ہے' یہاں زخموں پر کسی مرہم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ مرہم اور روئی اس ادب یا شاعری سے ترکیب پاتی ہے۔ جو فوجی شاعر کے سینے کے اندر موجود ہوتی ہے۔ زخم کے درد کا (پوری زندگی کے درد کا) اندازہ (جسے غالب لذت کہتا ہے) جتنا سپاہی کو ہوتا ہے۔ کسی عام آدمی کو ہو ہی نہیں سکتا۔ غالب نے اسی کیفیت کی شرح یوں لکھی ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پہ چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

ضمیر جعفری کو اگر یہ لذت نصیب نہ ہوتی تو وہ جزیروں کے گیتوں میں اس پنسنون کا کیسے انتخاب کرتا یا اسے اردو شاعری میں کیوں ڈھالتا؟

اناس سینے میں سوز خم کھا لے مگر رس اچھالے مگر رس پلائے
یونہی میرا دل (گرمئی آب و گل) غم کے کتنے بھیانک اندھیرے لئے ہے
مگر ان اندھیروں میں یوں جگمگائے کہ جیسے خوشی کے سویرے لئے ہے
اندھیروں میں چمکے' مصائب میں لپکے' جدائی میں چھلکے' حوادث میں گائے

سبحان اللہ کیا شاعری ہے' کیا دانش ہے' کتنی دردمندی ہے' کتنی

اپنائیت ہے' کتنی قربت ہے اس ماحول سے جس سے یہ شہید درد (انناس) اٹھا اور پروان چڑھا..... پھر پننتوں میں ڈھلا... اور آخر میں ضمیر کے رسیلے قلم میں حلول کر کے ہمیں پھل کی لذت کے ساتھ ساتھ دردمندی کی لذت بھی دے گئے۔

میں نے ایک زمانے میں صوفیوں کے ایک تذکرے میں یہ روایت پڑھی تھی کہ ایک گنوار ہل چلا رہا تھا مگر اپنے بیلوں کو بے دردی سے "پنجا" (وہ ڈنڈا جس سے بیلوں کو ہانکا جاتا ہے) مارتا تھا۔ سامنے سے حضرت ابوبکر شبلی گزرے' انہوں نے محسوس کیا کہ یہ "پنجا" ان کی پیٹھ

دائیں سے بائیں سید ضمیر جعفری' ابوالاثر حفیظ جالندھری' بریگیڈیر گلزار احمد' عزیز ملک'

پر لگ رہا ہے دیکھا تو واقعی ضربات کے نشان لگے ہوئے تھے دردمندی' یہ بھی ایک رنگ ہے' مگر میں نے جب احسان دانش مرحوم کی سوانح عمری جہان دانش میں احسان کا یہ ارشاد پڑھا کہ درخت میری کائنات کا محبوب ترین رفیق ہے تو مجھے بات عجیب نہ لگی لیکن جب اس کی دلیل انہوں نے دی تو احسان کا وہ نکتہ دانش مثبت طور پر میری محبوب کائنات بن گیا۔ وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ درخت سے زیادہ شریف اور شفیق مخلوق کہاں ملے گی جو دوست اور دشمن دونوں کو اپنے ٹھنڈے سائے سے یکساں بہرہ مند کرتا ہے.... اور اس کی یہ فیاضی اس شخص کے حق میں بھی ویسی ہی کھلے دل سے ہوتی ہے جو اسے کاٹنے اور اکھاڑنے کے لئے تبر اور کدال بغل میں تھامے ہوئے آتا ہے۔ حالانکہ کچھ دیر کے بعد اسے نیست و نابود کرنے کا ارادہ لے کر آتا ہے۔

احسان کی یہ تمثیل بھی میرے دل میں کھب گئی مگر نثر آخر نثر ہے اور ارشاد احسان کا ایک دردمندانہ نکتہ دانش ہے فقط۔ مگر ضمیر جعفری کے اشعار میں (اصلاً" وہ جس کے بھی ہیں) درد کا جو رس اور زخم کی جو لذت ہے اس کا "مزا" اس کی لذت مت پوچھئے۔ ذرا اس تصویر کاری پر نگاہ ڈالئے جو انناس کے زخموں پر چھری لگنے اور اس کے اندر سے مٹھاس کی دھاری پھوٹنے کی امیج سے بنتی ہے۔ اصل پننتنوں جس کا بھی ہے ضمیر کی اردوئے معلی اس کی اپنی ہے جس کا ہر ہر لفظ زرنگار اور جوئے درد کے آب شیریں کا مرکب ہے تو اعلان میرا یہ ہے کہ میں ابوبکر شبلی سے احسان تک اور احسان سے مافی الضمیر تک آپہنچا ہوں.....
اور یہ تیسرا وہ حرف درد ہے جو الف اور ب کے بعد جیم کی صورت میں جام جم بن کر میرے سینے کے اندر بیٹھ گیا ہے۔

میں پننتنوں کی کہانی میں خواہ مخواہ پھنس گیا ہوں' مجھے مترجم ضمیر سے زیادہ شعرشناس اور لفظ آشنا ضمیر کی بات کرنی چاہئے جو اس کے ہر منظوم مجموعے میں ہے۔ جزیروں کے گیت میں بھی' لہو ترنگ میں بھی اور مزاحیہ کلام میں بھی۔

میں ایک زمانے میں شاعری کا استاد رہا ہوں.... اور سب اتفاق کریں گے کہ شاعری پڑھانا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک طریقہ رموز شعر سے آگاہ کرنے کا یہ بھی ہے کہ معانی جو بھی ہوں سب سے پہلے لفظوں کو دیکھو جن سے کوئی شعرپارہ (یا منظومہ) ترتیب پاتا ہے' پھر ان لفظوں کی تصویر کاری کا تجزیہ کرو' پھر منظومے کے آہنگ کی شناخت کرو' اس کے حرفوں کے صوتیاتی اثرات کی تحلیل کرو' اس کے بعد یہ دیکھو کہ شاعر کے معانی کس تاثیر یا معنی تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ کیا مذکورہ بالا جملہ اجزائے تجزیہ اس کے اثر و مفہوم کی پیش کش میں برابر کا حصہ لے رہے ہیں یا نہیں' ضمیر کی شاعری کو اس طریق تحلیل سے بھی ناپا جا سکتا ہے اور دوسرے طریقوں سے بھی' لیکن الفاظ و ترکیب (الفاظ چرب و شیریں) اور تصویر کاری ہی کو اگر لے لیا جائے تو اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے من کی کائنات میں کون سے رنگ' کون سے ذائقے' کون سی خوشبوئیں رچی بسی ہوئی ہیں۔

ضمیر کی شاعری کا (اس نقطہ نظر سے) مجموعی تاثر چاندنی راتوں میں خواب آلود فضاؤں میں دل خوش کن پراسرار اندھیروں کی خاموشی جن کے سکوت کو چاندنی کے چھوٹے اور بڑے بادل ادھر ادھر بکھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کے رومانی مزاج کا پتہ دیتی ہے جسے نیم ہشیاری اور نیم مجبوری کہا جا سکتا ہے چھائی ہوئی ہے..... اس میں نیم کول خواب ہیں' چاندنی میں ناریل کی چھاؤں کا رقص و رم ہے' بانسوں کے خم ہیں' مدھر سپنے ہیں' بے باک کرنیں ہیں' رنگین دھاریاں ہیں' ناچتی لہریں ہیں' الجھی بیلیں ہیں' زہری ناگ ہیں' کانچ کی چوڑیاں ہیں..... غرض شباب و شاہد و شعر ہے جو ہر سو پھیل پھیل کر ضمیر اور مافی الضمیر دونوں کو منعکس کر رہا ہے..... اور اگر کوئی چاہے تو اس سے موسیقی کی دھنیں نکال لے یا رقص کے سرتال کے پیچ و خم سجا لے۔

اور پھر یوں اس شاعری کا وقار یوں بڑھ جاتا ہے کہ اس پر حسرت کاشمیری کی عینک اور مونچھوں کا سایہ بھی پڑا ہے اور یہ معمولی شے نہیں اس میں اختر شیرانی اور آغا حشر کاشمیری دونوں کے انگ اور رنگ مل جل گئے ہیں۔

یکجا باتیں لہو ترنگ میں ہیں۔ جس میں لہو کی آبشاریں گلاب و سمن کی کیاریوں کو سیراب کر رہی ہیں جس میں چاندی کے دریا جوان اور گمن ہیں' جہاں تلوار کا بانکپن بھی ہے اور چمن در چمن کہسار بھی ہیں (نظم

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور گلزار جاوید سے ہمہ تن گوش

ہے زمین وطن) وطن پر قربان ہو جانے کے لئے مشتعل جذبوں کا تند و تیز ارمانوں کا رقص ہے' تڑپتی بجلیاں ہیں اور برستی گولیاں ہیں جیسے کہساروں میں چشمے گونجتے گاتے ہوں یا صحرا میں بگولے رقص فرما رہے ہوں۔

تو رومانی الفاظ کا بادشاہ ضمیر یہاں بھی اپنے وطن کے پنتوں سنا رہا ہے۔ اس کے ترانے جوش اور مستی باہوں کی دھنوں کے اندر ڈھل جانے والے.... اور عام شہری کے لبوں سے جلد چپک جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

ضمیر نے مزاح نگاری بھی کی ہے مگر کسی کا دل نہیں دکھایا.... وہی اناناس کا رس'.... جو ہر موقعہ و مقام پر طرب افزا شگفتہ اور حیات بخش ہے' وہ الفاظ کا بادشاہ ہے ان کے الٹ پھیر سے مزاحیہ اثر پیدا کرتا ہے.... اور کہیں کرداروں کی مضحک عادتوں سے' ہنسی کا سامان پیدا کرتا ہے۔

ضمیر جس استاد کا شاگرد ہے اس کا سچا اور مخلص شاگرد ہے۔ حسرت کاشمیری کے مطائبات (حرف و حکایت) کا اچھا ملخص یعنی انتخاب پیش کیا ہے.... اور میرا تجزیہ ہے کہ ضمیر نے ہمیں اصل سندباد جہازی سے بہتر سندباد دیا ہے۔

نثر نگار ضمیر جب سنجیدہ تحریر پیش کرتا ہے تو ہمیں وہ صرف ضمیر نظر آتا ہے لیکن جہاں اندر کی شگفتگی ابل پڑتی ہے تو وہاں ہمیں وہ شخص پھر مل جاتا ہے جسے ہم ضمیر جعفری کے روپ میں جانتے پہچانتے ہیں اور جس سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔

ضمیر جعفری

شفیق الرحمٰن

مقبول شاعر، نثر نگار، کالم نویس اور بذلہ سنج ضمیر جعفری کو کون نہیں جانتا؟ شاید وہ معدودے چند نہ جانتے ہوں جو جان بوجھ کر کسی کو بھی نہیں جاننا چاہتے۔ ضمیر ان خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جنہیں اردو ادب کی شاندار روایات کے مطابق مشہور ہونے میں کم از کم نوے سو برس نہیں لگے، بلکہ محض پینتیس سال کے "قلیل" عرصے میں ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ (یہ اور بات ہے کہ مغربی ممالک میں مصنفین یہ مرحلہ مہینوں میں طے کر لیتے ہیں)۔

ضمیر جو اب فری لانسر ہیں پی-این-سی اسلام آباد کے ڈی-ڈی-جی بننے سے پہلے سی-ڈی-اے کے ڈی-پی-آر تھے جہاں انہیں ٹی-کیو-اے بھی ملا تھا۔

اس سے پہلے آپ فوج میں میجر رہے اور اس سے قبل روزنامہ "بادشمال" کے نامہ نویس، مدیر، مالک یعنی سب کچھ "بادشمال" سے پہلے مشرق بعید میں (جسے FAR EAST کہا جاتا تھا اور غالباً" اب بھی کبھی کبھی کہا جاتا ہے) تعلقات عامہ (اور شاید تعلقات خاصہ) کے سلسلے میں قیام رہا۔ سنگاپور میں جناب چراغ حسن حسرت کی رفاقت میسر تھی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران خاصے اچھے دن دیکھے (ویسے آج کل بھی کچھ وقت برا نہیں گزر رہا ہے)

اس سے پہلے یعنیی سمندر پار جانے کی تیاری میں لاہور کے صحافتی گوشوں میں نہایت عمدہ کوچہ گردی کی۔ چنانچہ صحافت سے کچھ ایسی CONFRONTATION رہی کہ صحافت اور ضمیر دونوں مستفیض ہوئے۔ اور اس سے ذرا پہلے اسلامیہ کالج لاہور کے اولڈ بوائے بننے میں مصروف رہے۔ کالج کے رسالے کریسنٹ کو بھی آؤٹ کیا۔

اس سے قبل 1938ء میں وہیں گریجویٹ بن چکے تھے۔ آپ کا کلام ممتاز رسائل میں چھپنے لگا تھا اور لاہور کی مشہور ادبی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوا کرتیں۔ چونکہ بی-اے سے پہلے ایف-اے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا کیمبل پور سے ایف-اے کی سند لینی پڑی۔ وہاں بھی کالج میگزین کی ادارت نے پیچھا نہ چھوڑا یا VICE VERSA اور ایف اے کے لئے دسویں جماعت جہلم سے پاس کی گئی۔ وہاں آپ نے پہلی مرتبہ شعر کہنے شروع کئے اور سکول کے ملک الشعراء تصور کئے جاتے۔ چونکہ میٹرک کیا تھا اس لئے مڈل کلاس میں بھی پاس ہوئے ہوں گے۔ جس کے لئے پرائمری جماعتوں میں پڑھے ہوں گے۔ اس سے قبل لازمی طور پر آپ چھوٹے سے بچے ہوں گے اور موجودہ عمر یعنی 66 ناٹ آؤٹ کے مطابق (جس میں ایک بھی LEG بائی یا OFF بائی شامل نہیں) سنہ انیس سو کچھ کے کسی مہینے میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ پیدائش سے پہلے البتہ آپ گمنام تھے۔

ضمیر جیسے منجھے ہوئے ادبی VETERAN کو طرح طرح کے تجربے ہوئے ہیں اور یہ تجربے اب تک جاری ہیں۔ یوں تو تنقید برائے تنقید کے سلسلے میں نقاد یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ضمیر کو فنون لطیفہ کی جانب کچھ اور رغبت دکھانی چاہئے تھی۔ یعنی وہ کم از کم تجدیدی آرٹ ہی سیکھ لیتے اور کچھ نہیں تو انشائیے۔ (جو کچھ بھی وہ ہوتے ہیں) لکھنے کی کوشش کرتے۔ فن موسیقی کی محبت میں انہیں وائیں یا طبلہ بجانا چاہئے تھا۔ انسانیت کی نبض شناسی کے لئے انہوں نے حکمت کا شغل کیوں نہیں اختیار کیا؟ قدرت کی عظمت، رفعت، وسعت وغیرہ سے آشنا ہونے کے واسطے وہ اونچے پہاڑوں کی مشہور چوٹیاں سر کرنے والی پارٹیوں کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ خوشنما نظاروں سے بھرپور نظاروں سے فیضان حاصل کرنے کے لئے انہوں نے محکمہ جنگلات میں ملازمت کیوں نہیں کی؟

اور یہ کہ اب تک ایم اے (اردو) کا امتحان تک نہیں دیا۔ بلکہ ابھی تک شاید خضاب بھی نہیں لگایا...... اور کچھ نہیں تو محض اس شعر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کہ۔

دشمن زندگی است موئے سفید
روئے دشمن سیاہ باید کرد

وغیرہ وغیرہ

راقم الحروف ایسی باتوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

جہلم کے کوہستان نمک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے نظم، نثر اور گفتگو میں دلاویز نمکینی ہے۔ آپ کے بزرگ نامی گرامی مرشد تھے۔ تبھی قناعت بے نیازی اور ۔

ہو گئی بار گراں بندہ نوازی تیری
تو نہ کرتا اگر احسان تو احساں ہوتا

کی بدولت ملی ہے۔

شروع شروع کی شاعری سنجیدہ تھی۔ لیکن قسمت..... اور ضمیر جعفری ..... کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ اب یہ حال ہے کہ تحریر ہو یا تقریر کچھ بھی نہ ہو..... ہر وقت طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔

لیکن جب کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو ایک طرف ہو کر چپکے سے سنجیدہ شاعری کر جاتے ہیں۔ ان کی صحت مندی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ سپورٹس مین رہ چکے ہیں اور کھلاڑیوں کا مشہور مقولہ ہے کہ :۔

ONCE A SPORTSMAN ALWAYS A SPORTSMAN

آپ کی جوانی کا ایک شعر ہے۔

تیرے کوچے میں یوں کھڑا ہوں میں
جیسے ہاکی کا گول کیپر ہوں

یعنی جہاں اپنے نظرانداز کئے جانے کا سرسری طور پر گلہ کیا ہے وہاں اپنی اہمیت بھی جتا دی ہے کہ گول کیپر چاہے، تو اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ ٹیم کو ہرا سکتا ہے۔ کئی برس ہوئے راولپنڈی میں ویسٹ انڈیز اور مقامی ٹیم کا میچ ہو رہا تھا اس میں فاسٹ بولر بلکہ بے حد فاسٹ بولر HALL کے تابڑ توڑ حملوں کا فی البدیہہ ذکر سٹیڈیم میں بیٹھ کر یوں کیا۔

شور اٹھا کہ ہال آتا ہے
کھیل کا انتقال آتا ہے
ہال سے بال آتی ہے
بال سے پہلے حال آتا ہے

یا تو یہ اشعار ہال نے سن لئے (اور سمجھ لئے) یا ہماری ٹیم نے ضمیر کا اندازہ درست نکلا۔ اگلے ہی ہفتے لاہور کے ٹیسٹ میچ میں یکے بعد دیگرے تین کھلاڑیوں کو آؤٹ کر کے نہ صرف "ہیٹ ٹرک" کیا بلکہ کھیل کا مکمل طور پر انتقال بھی کر دیا۔

ضمیر کی شاعری کیسی ہے؟ نثر کی کیا خصوصیات ہیں؟ صحافتی تحریروں کا درجہ کیا ہے؟

خوبیاں بیان کرنے لگوں (جو کرنا چاہتا ہوں) تو فطری انکساری کی وجہ سے شاید ضمیر اسے پسند نہ کریں۔ اور اگر الٹی سیدھی تنقید کرنے کی کوشش کروں (جو بالکل نہیں چاہتا) تو پڑھنے والوں کو اچھی نہیں لگے گی۔ لہٰذا باکسنگ کے ریفری کی طرح یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس CORNER بس ضمیر ہیں اور دوسرے کارنر میں ان کا قاری..... اور SECONDS یعنی دیگر لوگ) ادھر ادھر ہو جائیں..... اب قاری جانے اور ضمیر۔ ضمیر کے مجموعوں میں جو کچھ پہلے اور آخری صفحے کے درمیان ہے وہ مقبول ہے اور جو بین السطور ہے وہ اور بھی زیادہ پسندیدہ ہے:

(بائیں سے نذیر احمد شیخ (مرحوم)' غلام علی بلبل اور سید ضمیر جعفری

"ست رنگا"

ضمیر جعفری

۱۹۹۳ء

ٹھہریے ایک بات واضح کروں کہ ضمیر مزاحیہ کلام کی وجہ سے بڑا ہے شخصیت کی وجہ سے نہیں۔

آپ کہیں گے کہ میاں تو ناقد تو نہیں تو تو کہانیاں کہنے والا ہے تجھے کیسے پتہ چلا کہ ضمیر کلام کی وجہ سے بڑا ہے۔

یہ بھی سن لیجئے۔ ہوا یوں کہ ریڈیو پاکستان نے مجھے حکم دیا کہ مزاحیہ پروگرام کرو۔ چار سال میں وہ پروگرام چلاتا رہا۔ یہ پروگرام معجون مرکب تھا

ممتاز مفتی

ضمیر کا خاکہ لکھنے کی میری آرزو بہت پرانی ہے کئی بار لکھنے بیٹھا۔ قلم اٹھایا ہر بار رک گیا۔ چل نہ سکا۔ حیران ہوا۔ سوچا ضمیر پر لکھنے میں ہچکاہٹ کیوں۔ مانا کہ چیز ٹیڑی ہے لیکن ایسی بھی کیا۔

پھر سوچتے سوچتے ایک روز بھید کھل گیا۔ پتہ چلا کہ ہچکچاہٹ اس لیے ہے کہ لاشعوری طور میں ضمیر کو بڑا مانتا ہوں اور چونکہ ذات کا چھوٹا ہوں اس لیے بڑوں پر بات کرنے سے گھبراتا ہوں۔

صاحبو بڑے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ میں صرف علمی ادبی بڑوں کی بات کروں گا ایک بڑے وہ ہوتے ہیں جو بڑے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ وہ بڑے ہیں۔

ایسے بڑے موجود تو ہیں پر وہ اپنا پتہ نہیں دیتے" خود کو پتہ نہیں دیتے ہمیں کیا دیں گے۔ سیانے کہتے ہیں گگی آدھ بھری ہو تو چھلکاتی ہے شور مچاتی ہے بھری ہو تو گم ہو کر بیٹھ رہتی ہے۔ دوسرے بڑے وہ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ جانیں کہ وہ بڑے ہیں۔ اس قسم کے بڑے دنیائے ادب و فن میں عام ملتے ہیں۔ کراچی اور لاہور ایسے بڑوں سے بھرے پڑے ہیں ضمیر جعفری تیسری قسم کا بڑا ہے۔

تیسری قسم کے بڑے تذبذب کا شکار ہیں۔ چکی کے دو پاٹوں تلے پس رہے ہیں۔ ہوں 'نہیں ہوں'، ہوں نہیں ہوں۔

ان کی کیفیت جلتی بجھتی حسین سائین جیسی ہے۔ جل گئی تو ہوں بجھ گئی تو نہیں ہوں۔ شک و شبہ کا آرا چلتا رہتا ہے۔

ضمیر جعفری اس بات کا محتاج ہے کہ کوئی اس کے گھر کی کنڈی بجائے اور کہے ضمیر جعفری آپ بڑے ہیں۔ یہ خوشخبری سن کر ضمیر کا دل پشوری ہو جاتا ہے لیکن دو گھنٹے کے بعد پھر شک و شبہات ابھرتے ہیں۔ حسین سائین بجھ جاتی ہے اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ صاحبو اب ایسا کون ہے جو ہر دو گھنٹے کے بعد ضمیر کے گھر کی کنڈی بجاتا رہے۔

جس میں اردو کے جانے پہچانے مزاح نگار شاعروں کی نگارشات پیش کی جاتی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ ضمیر کے کلام کی سطر سطر بولتی ہے۔ بات ایسی لطافت سے قاری تک پہنچتی ہے کہ جھبتی نہیں۔ گدگداتی ہے فرحت کا احساس چھوڑ جاتی ہے۔

اس پروگرام میں مجھے پتہ چلا کہ ضمیر جعفری مزاحیہ شاعری میں بڑا ہے۔ بہت بڑا۔ مزاحیہ شاعروں کے راستے میں ایک سخت مقام آجاتا ہے بہت جلد انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں قاری اور سامع میں مزاح کی لطافت کا احساس بہت کم ہے۔ لیکن طنز پر واہ واہ ہوتی ہے لہٰذا وہ فن کو چھوڑ کر واہ واہ کی جانب چل پڑتے ہیں۔

مثلاً انور مسعود بڑے طمطراق سے آیا تھا خالص مزاح کا پٹارا ساتھ لایا تھا لیکن جلد ہی واہ واہ نے اپنا جادو جگایا اور وہ طنز کی جانب چل پڑا۔ اور اب دلدار بھٹی کی طرح ٹیلی ویژن کمپیئرنگ کے قبرستان میں دفن ہو چکا ہے۔ خدا مغفرت کرے خالص مزاح نگار تھا۔

محمود سرحدی میں مزاح کی بڑی حس تھی ہم امیدیں لگائے بیٹھے تھے لیکن اسے سیاست کھا گئی دلاور فگار لفظوں کے بھنور میں ڈوب گیا ضمیر جعفری واحد مزاح نگار شاعر ہے جس نے طنز کی واہ واہ کو نظر انداز کر دیا۔ ضمیر طنز کرے بھی تو وہ اتنی لطیف ہوتی ہی کہ جھبتی نہیں۔

لیکن ٹھہریے میں کیا کر رہا ہوں۔ میں فن کے ایوان میں کیسے آگھسا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں۔ میرا موضوع تو شخصیت ہے۔

شخصیت پر بات کرو تو مختصر یہ ہے کہ ضمیر جعفری کا فن جس قدر لطیف ہے اس کی شخصیت اتنی ہی کثیف ہے۔

یوں سمجھ لیجئے کہ ضمیر کی شخصیت میں بھان متی نے کنبہ جوڑ رکھا ہے وہ چوں چوں کے مربے جیسی ہے۔ لیکن شاید آپ چوں چوں کے مربے سے

واقف نہ ہوں۔ آپ نے حکیم کے نسخے کا پڑا ضرور دیکھا ہوگا۔ اس میں بنفشہ ہوتا ہے عناب ہوتے ہیں ریشہ خطمی ہوتا ہے۔ استو خودوس ہوتا ہے۔ فل فل ہوتا ہے ابریشم ہوتا ہے پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔

ایسی ہی ضمیر میں ایک سیدھے ایک صوفی ہے ایک بزرگ ہے ایک پیرزادہ ہے ایک رند ہے ایک مے خوار ہے' ایک درویش ہے' ایک خسیس ہے ایک جی حضوریہ ہے ایک زن مرید ہے' ایک پینڈو ہے۔ ساتھ ہی ایک مسٹر بھی ہے۔ وہ مسٹر جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ۔

پن کھلی ٹائی کھلی فلکس کھلے کار کھلا
کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں مسٹر کھلا

ضمیر کی شخصیت کے متعلق پورے طور پر وہ لوگ جانتے ہیں جو اس کے قریب رہتے ہیں۔

دوستو دعا کرو کہ ضمیر جعفری کے قریب رہنے کا کسی صاحب قلم کو موقع نہ ملے۔ جسے مل گیا سمجھ لو وہ پھانسی لگ گیا۔ پرانے زمانے میں ایک مثل مشہور تھی۔

کبڑے سے کسی نے پوچھا تھا تو کیا چاہتا ہے۔ تیرا کبڑا پن دور ہو جائے یا سب لوگ کبڑے ہو جائیں۔

کبڑا بولا میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں۔

صاحبو جان لو کہ ضمیر وہ کبڑا ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ سب لکھنے والوں کو مزاح کا عارضہ لاحق ہو جائے۔ جو صاحب قلم اس کے قریب ہو جاتا ہے ضمیر اس کے دل میں یہ خوش فہمی پیدا کر دیتا ہے کہ "تم میں مزاح کی بڑی صلاحیت ہے"

جناب والا میں ناقد تو نہیں ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مزاح ایک خودرو پودا ہے وہ اگایا نہیں جاتا گملے میں لگایا نہیں جا سکتا۔

صاحبو ہر نثر نگار کی تصنیف میں کہیں کہیں یہاں وہاں' مزاح پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر نثر نگار کو گمان پیدا ہو جائے کہ وہ مزاح نگار ہے اور اسے لازماً مزاح پیدا کرنا ہے تو وہ بیچارہ پھانسی لگ جاتا ہے۔

صاحب قلم کی سب سے بڑی مشکل جو ہے اس کا ہمیں احساس نہیں۔ یہ مشکل بالکل ایسی ہے جیسے آج کل کی نوجوان ماڈرن لڑکی کو درپیش ہے۔

آج کل کی ماڈرن لڑکی کو اپنی میک اپ اور ناز نخرے کے زور پر ایک خاوند کو پھنسا لینا تو آسان کام ہے لیکن پھر اسے زندگی بھر Keep کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست کی شادی ہو گئی میں اسے ملنے گیا میں نے حسب دستور اس سے پوچھا' میں نے کہا بتا کیسی بیوی ملی ہے تجھے۔

کہنے لگا یار میں تو مارا گیا۔

میں نے پوچھا کیا ہوا۔

بولا۔ میری بیوی اتنی حسین ہے کہ میں اسے ہاتھ لگاؤں تو وہ میلی ہو جاتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ پھر

بولا پھر کیا میں تو اس کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں

ایک سال کے بعد مجھے پھر اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا دیکھا کہ پڑوسن کو تاڑ رہا تھا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شوہر پھنسا لینا کچھ مشکل نہیں لیکن پھر اسے زندگی بھر Keep کرنا۔ پھانسی لگ جانے کے مترادف ہے۔ یہی مشکل لکھنے والے کی ہے۔ ایک جاذب توجہ کتاب لکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ پھر اپنے معیار اور تاثر کو زندگی بھر قائم رکھنا پھانسی لگ جانے کے مترادف ہے۔

ضمیر نے کئی ایک صاحب قلم نثر نگاروں کو مزاح نگاری کی خوش فہمی دے کر انہیں پھانسی پر لٹکا دیا۔

جس طرح ضمیر کی شخصیت ست رنگی ہے ایسے ہی اس کا فن بھی ست رنگا ہے۔ ضمیر سنجیدہ کلام لکھتا ہے مزاحیہ کلام لکھتا ہے رزمیہ نظمیں دیکھو تو لگتا ہے جیسے بہت بڑا مجاہد ہو۔ ملی گیت دیکھو تو لگتا ہے جیسے پاکستان کے عشق میں گھل گھل کر پتہ نہیں کیا بن چکا ہو۔ صوفیائے ---- پنجاب کے کلام کا اردو میں ایسا ترجمہ کرتا ہے جیسے ابھی ابھی خرقہ ولایت وصول کر کے آیا ہو۔ گوروں کی لکھی ہوئی منظوم نظموں کا ترجمہ ایسے کرتا ہے کہ اصل شرما جائے!

بہت پرانی بات ہے سردیوں کا موسم تھا ان دنوں موسم سرما میں مری پر ہو کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔ اتفاق سے مری کے ایک ہوٹل میں چند شعرا اکٹھے ہو گئے وہاں کسی نے کوک شاستری کلام چلا دیا۔ اس رات ضمیر جعفری نے کوک شاستری کلام کی وہ وہ باونڈریاں ماریں کہ پنڈت کوکا شرم سے پانی پانی ہو گئے کہ میں نے اپنے شاستر میں یہ عظیم نسخہ جات کیوں نادرج کئے۔

اس روز مجھے پتہ چلا کہ ضمیر نے کہا بہت کچھ ہے چھپوایا بہت کم ہے۔

ضمیر کی شخصیت کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ایک آرام طلب فرد ہے۔

میری دانست میں وہ زندگی بھر عشق و شق کے جھمٹ میں نہیں پڑا۔ یہ شوق صرف صبر آزما ہی نہیں مشقت طلب بھی ہے۔ کون کھڑکیاں کھولے دیواریں پھلانگے۔ رت جگے کرے۔ وہ مشہور زمانہ شعر حضرت میر نے ضمیر پر لکھا تھا کہ

ہوگا کسی دیوار کے سائے تلے ضمیر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اس حوالے سے ضمیر کا وہ کوک شاستری کلام مشاہداتی نہیں تھا خالص الہامی تھا۔

میرا دوست اشفاق حسین ہومیو ڈاکٹر ایک روز سر پیٹتا ہوا میرے پاس آیا کہنے لگا مفتی ہم تو خالص الو کے پٹھے ہیں۔
میں نے کہا وہ کیسے۔
ہم نے ساری عمر غلط فہمی میں گزار دی۔
میں کہا ہوا کیا۔ کھل کر بات کر۔
کہنے لگا۔ آج میں نے ایک حقیقی دانشور کی زیارت کی ہے سبحان اللہ ہیٹس آف ٹو ہم
میں نے کہا ہوا کیا۔
کہنے لگا آج میرے مطب میں ایک مریض آیا۔ اس نے اپنے سمٹمز بتائے۔ میں نے کہا گھبرایئے نہیں۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں صرف حرارت غریزی کی کمی ہے میں آپ کو ایک ٹانک لکھ دیتا ہوں۔
اس پر وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
کہنے لگا ڈاکٹر صاحب مجھے کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں آپ۔ کیا آپ کے پاس ایسی پڑیا نہیں جو میں اپنی بیوی کو کھلا دوں۔

لگتا ہے ضمیر ایسا ہی غیر مشقتی آرام طلب ہے۔ یہ بھی ہمارے لئے Blessing in Disguise ہے ضمیر زعفرانی نثر بھی لکھتا ہے۔ سفرنامے لکھتا ہے۔ کالم لکھتا ہے۔ خاکے لکھتا ہے۔ نثر رواں انداز میں لکھے جاتا ہے۔ اگر وہ دل لگا کر توجہ اور محنت سے نثر لکھتا تو ہم نثر نگاروں کے لیے مشکل پڑ جاتی۔ میرے ایک دوست نے مجھے ضمیر کا خاکہ لکھتے ہوئے دیکھا کہنے لگا بتاؤ یار۔ میں تو ضمیر کو شاعر ہی نہیں مانتا۔
وہ کیسے میں نے حیرت سے پوچھا۔
کہنے لگا ضمیر میں شاعرانہ بات ہی نہیں۔
کیا مطلب

بولا۔ شاعر لوگ اپنا نام اچھالنے کی نسبت دوسرے شعرا اور ادیبوں میں کیڑے نکالنے کے زیادہ شوقین ہوتے ہیں۔ ضمیر نے آج تک کبھی دوسروں کی نندا نہیں کی۔ ضمیر کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی اسے گالی نہیں دیتا۔ نہ وہ ہا شلیبٹی پالتا ہے نہ جنزیٹ کرتا ہے۔ البتہ اسے اپنا نام اچھالنے کا بہت شوق ہے۔ بے شک ضمیر کو اپنا نام اچھالنے کا بہت شوق ہے لیکن اسے نام اچھالنے کا فن نہیں آتا۔ سمجھتا ہے کہ کام سے نام اچھلتا ہے۔ لکھے جاتا ہے لکھے جاتا ہے یوں اندھا دھند کام کیے جاتا ہے جیسے کام کھل جا سم سم ہو۔

نام اچھالنے کا فن کسی کسی کو آتا ہے ہر کسی نے اپنا طریق واردات ایجاد کر رکھا ہے۔ منٹو بڑی محنت سے گالی کھاتا تھا

میں نے توجہ طلبی کے لیے عجز کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ ہمارے لاہور کے دو بڑوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا شغل اپنا رکھا ہے۔ مقصد عیب جوئی نہیں بلکہ توجہ طلبی ہے انہوں نے درپردہ آپس میں سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ ہم احمق ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ عداوت ہے۔ دراصل انہوں نے یہ بھید پا لیا ہے کہ پراپے گنڈا کبھی منفی نہیں ہوتا۔ صاحبو سلف پروجیکشن بہت بڑا آرٹ ہے آپ نے اس خاتون کی کہانی سنی ہوگی جس نے اپنی نئی ہیرے کی انگوٹھی دکھانے کے لیے اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی اور رو رو کر محلے والوں کو انگوٹھی دکھا دکھا کر کہتی تھی سب کچھ جل گیا صرف یہ انگوٹھی بچ گئی ہے۔ سلف پروجیکشن کے لیے لوگوں نے بڑے منفرد طریقے ایجاد کیے۔ کرشن چندر بہت بڑا بیورو کریٹ تھا لیکن زندگی بھر غریب نواز کا ڈھونگ رچائے رکھا جوش نے تفاخر کو اپنائے رکھا۔
میرا جی نے بیراگی کا سوانگ بھرا۔
ضمیر بہت گھوما پھرا شخص ہے۔ وہ دنیا کے تمام ممالک میں گھوم پھر آیا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ ضمیر سیاحت پسند ہے۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میری دانست میں یہ سیاحت پسندی نہیں بلکہ لذت آوارگی ہے۔ اس کی ساری زندگی لذت آوارگی کی شاہد ہے پہلے کلرکی کی پھر فوج میں بھرتی ہو گیا فوج سے استعفیٰ دینے کے بعد گاؤں میں آ کر الیکشن لڑا سودا بازی کی اور پھر سے فوج میں پبلسٹی آفسر بن گیا۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد سی ڈی اے میں پبلک ری لیشن افسر بن گیا پھر افغانستان کے ڈائریکٹوریٹ میں پبلسٹی افسر بن گیا وہاں سے فارغ ہوا تو اکادمی میں ایڈیٹری جاب سنبھال لی۔ یعنی ساری زندگی یہاں سے اڑا وہاں جا بیٹھا کی مصداق گزار دی۔ اگر کسی ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتا تو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے پتہ نہیں کس عہدے پر پہنچتا۔

ملک ملک گھومنے پھرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گھر میں گھر والی کا راج ہے۔ وہاں پابندیوں میں۔ ضمیر کو جی حضور کا رول ادا کرنا پڑتا ہے لہٰذا آوارگی کے بغیر چارہ کار نہیں۔
ضمیر نے حال ہی میں اپنی کہانی قومی ڈائجسٹ میں شائع کی ہے۔ بڑے دلکش انداز میں اپنی طبعی آوارگی کا اظہار کیا ہے۔
قدرت نے اس فن کار کو رولنگ سٹون کا رول اس لیے عطا کر دیا تاکہ پالش ہو جائے۔ اس کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو اور وہ MOSS اکٹھی نہ کر سکے۔ چونکہ MOSS فنکار کی دشمن ہے وہ زنگ آلود کر دیتی ہے۔
اسے آوارگی اس لیے بخشی گئی کہ اس کی حساسیت میں نت نئے چراغ روشن ہوں۔ صاحبو اللہ جسے چاہے عزت عطا کرے۔

سید ضمیر جعفری

شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

اردو کانفرنس راولپنڈی میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور میاں حیات بخش (درمیان میں)

بعض شخصیات اس قدر دل آویز ہوتی ہیں کہ ان کے بارے میں گفتگو کرنے کی خواہش بھی اپنے بارے میں گفتگو کرنے کا بہانہ معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے اکثر و بیشتر حضرات کو دوسروں کے بہانے اپنے اوپر گفتگو کرتے دیکھا ہے۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ سخن فہمی اور طرفداری میں مقابلہ ہونے لگتا ہے۔ میں اس اہل علم کی محفل میں ضمیر جعفری صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ اہل دانش کی محفل ہے اور اس لئے میں ضمیر جعفری صاحب کی تفہیم کے سلسلہ میں اپنی لغزشوں کے لئے پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

صاحبو! اس وقت ضمیر جعفری صاحب اپنی زندگی کے اسی سال کے سنگ میل سے صرف کچھ ماہ ہی دور ہیں۔ ان کا اصل نام سید ضمیر حسین شاہ ہے۔ سلطان العارفین سید محمد شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے پوٹھوہار کے علاقہ کی ایک بڑی گدی کے پروانوں کے لئے خصوصی توجہ کے مرکز رہے ہیں۔ میں ان کا ایک عرصہ سے نیاز مند ہوں۔ گزشتہ دس سال کے اندر اندرون ملک ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ اور بیرون ملک سفر کے دوران انہیں قریب سے دیکھا ہے علاوہ ازیں میں ان کے بہت سے قریبی دوستوں کا قریبی دوست ہونے کی وجہ سے اور سب سے زیادہ ڈاکٹر طارق محمود مرزا سے قربت کے باعث ضمیر

جعفری صاحب میرے لئے کھلی کتاب ہیں۔ میں اس کتاب کو نہ بھی پڑھوں تو میں ان کی کتاب زیست کی تاریخ اور جغرافیہ سے کسی قدر واقف ہوں۔ ممکن ہے کہ ضمیر جعفری کی شاعری کے سخن فہم ہونے کا دعویٰ نہ کرسکوں لیکن میں ان کی شاعری کا طرفدار ضرور ہوں۔ میں ان کی شاعری کو اس قبیلہ کی شاعری سمجھتا ہوں جو ترقی پذیر سماجوں میں منافقت، ریاکاری، بے انصافی اور منزل سے پیہم دوری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی ہے۔

ضمیر جعفری کی شاعری اور شعری روایت ایک شاعر خود آگاہ اور دنیا آگاہ فرد کی شاعری اور شعری روایت ہے ان کی مزاحیہ شاعری، دراصل ہماری زندگی کی ناہمواریوں اور قابل طنز رخ کو براہ راست بے نقاب کرتی ہے اور ان کی سنجیدہ شاعری زندگی کی بصیرت افروز اقدار سے ہر دلعزیز اور باضمیر شاعر ہیں۔ وہ غاصبوں اور آمروں کے سامنے بھی کلمہ حق ادا کئے بغیر نہیں رہے لیکن اس قدر عمدگی کے ساتھ کہ یہ حضرات بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر وہ کون سا احتجاج ہے جو ان کی ظریفانہ شاعری میں نہیں ملتا اور وہ کون سا رخ ہے جو ان کی سنجیدہ شاعری کو اس عہد کی عصری حسیت کا آئینہ دار نہیں بناتا۔

میں سب سے پہلے ضمیر جعفری کی شخصیت کے اس بنیادی رخ کی طرف آتا ہوں جو علم و ادب سے بہت گہرے لگاؤ کا آئینہ داری نہیں ان کا بہت اچھا تعارف بھی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے دوران برٹش انڈین آرمی کے ایک افسر کی حیثیت سے انہوں نے ملایا اور انڈونیشیا کی شاعری کی اہم صنف سخن پنتون سے بظ اندوزی کے لئے ملائی زبان پر دسترس حاصل کی RAFFLES LIBRARY جو سنگاپور کے بانی کے نام پر

۱۹۶۵ء۔ اپنے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ کے ساتھ

محبت کی شاعری ہے۔ شاعری کا ایک حصہ نشتر زنی کرتا ہے تو دوسرا حصہ شب غم کے ستائے ہوؤں کو سکون بخشتا ہے۔ شاعری خواہ سنجیدہ ہو یا مزاحیہ مال کار خود کو پانے کی جستجو ہی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خود کو پانے کا عمل بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ انگلیاں فگار ہوتی ہیں اور پاؤں میں آبلے بھی پڑتے ہیں۔

سید ضمیر جعفری میرے بزرگ دوست ہیں اور مجھے ان کے ساتھ اپنی دوستی پر ناز ہے۔ گزشتہ دس سال میں شاید ہی ایسا کبھی ہوا ہو کہ وہ کراچی آئے ہوں اور میری ان کے ساتھ بے تکلفی کی صحبتیں نہ رہی ہوں۔ ناروے اور انگلستان کے سفر کے دوران خوش قسمتی سے سیاست، شاعری، شعری روایت، کلاسیکی شاعری، جدید شاعری، ترقی پسند شاعری، نئی شاعری اور مغربی شاعری کے موضوعات پر گفتگو کے اتنے مواقع فراہم ہوئے کہ میں یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ضمیر جعفری ایک

قائم کی گئی ہے اس میں موجود پنتنوں کی کتابوں کو کھنگال کر رکھ دیا اور اپنے اوپر ملایا کے لوگوں سے ملائی بولنے کی شرط عائد کی اور بقول مولانا چراغ حسن حسرت، سید ضمیر جعفری نے "پنتون" جمع کرنے اور انہیں اردو کا لباس پہنانے میں جس محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے اس سے وہی لوگ واقف ہیں جو اس کے ساتھ ملایا میں موجود تھے.... میں نے خود دیکھا ہے کہ کسی دکان پر کھڑے ہیں۔ دکان دار سے مول تول کر رہے ہیں۔ وہ انگریزی سمجھ سکتا ہے لیکن انہیں اصرار ہے کہ ملائی زبان ہی میں گفتگو کریں گے اس لئے "بربابرگاہر گابربا" کئے جا رہے ہیں۔ جہاں کوئی فقرہ نہیں سوجھتا وہاں اشاروں سے مطلب ادا کر دیتے ہیں...... یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اردو زبان میں اس سرزمین کے متعلق ایک کتاب بھی موجود نہیں ہے اور یہ کام ضمیر جعفری ہی نے کر دکھایا کہ اردو زبان کو ملائی زبان کی شاعری کے بہترین رخ سے متعارف

کرایا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ملائی اور انڈونیشی اور اردو زبانوں کی تخیلی جنیس کو قریب لانے میں سید ضمیر جعفری نے اہم کردا ادا کیا ہے تو زیادہ غلط نہ ہو گا۔

ضمیر جعفری انگریزی ادب اور بالخصوص انگریزی مزاح کے رسیا ہیں اور انہوں نے اسکالش DOGGERLS BALLADS اور نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی مزاحیہ شاعری میں زبان بیان کے ساتھ برتاؤ میں اینگلو سیکسن ANGLO SAXON خوبی یعنی کفایت لفظی جابجا ملتی ہے۔ وہ الفاظ کو بہت ذمہ داری کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ان کی نثر اور نظم بہت تہہ دار ہوتی ہے ایک مدت سے میں اپنی رائے پر قائم ہو کہ ضمیر جعفری جس قدر اچھے انسان ہیں اسی قدر اچھے نثار اور اچھے شاعر ہیں۔ حالانکہ خاصی تعداد میں بہت واجبی ذہانت کے حامل، حاسد اور تنگ نظر افراد بھی اچھی نثر اور اچھی شاعری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کمال فن ایسے لوگوں کو اچھا انسان بنانے کے کام سے صاف مکر گیا۔

ضمیر جعفری اردو کے ممتاز مزاح نویس ہیں۔ ان کی خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ مولانا چراغ حسن حسرت ان کے رہنما اور پوٹھوہار میں قیام پذیر اردو کے ہم عصر مزاح نگاروں کا پورا قافلہ ان کے ساتھ رہا انہوں نے ایک طرح سے اس ملک میں مزاح اور اچھے مزاح کی ضرورت کا احساس دلایا جب ہمارے صاحبان اقتدار اپنی کج فہمیوں اور ناعاقبت اندیشانہ حرکات کی وجہ سے پوری قوم کو ہدف استہزاء بنائے ہوئے تھے۔ مزاح نگار آمروں سے مزاح کے ہتھیاروں سے لڑتا ہے جب کہ طالع آزماء خوشامد اور چاپلوسی کی لوری دیتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری نے وہی کام کیا جو حبیب جالب اور بعض دوسرے شعراء کی احتجاجی شاعری نے۔ ضمیر جعفری کی پر اعتماد شخصیت کا مزاح (HUMOUR) بھی پر اعتماد ہے ان کا مزاح مشاہدہ اور مطالعہ کے سنجوگ سے تخلیق پاتا ہے۔ نظریہ ساز ش یا سنار کی دکان میں زیوارت کے بجائے الفاظ اجالنے سے نہیں۔ اس لئے ان کے مزاح کا حملہ فی الفور ہوتا ہے اور وہ "آنا فانا" میں جزو ذہن بن جاتا ہے۔

میں ضمیر جعفری کی خوبصورت نثر و نظم کا دلدادہ ہوں۔ خوبصورت نثر کا بطور خاص۔ خوبصورت نثر بھی کیا چیز ہے۔ تحریر کیا گیا ہے کہ انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ آسکر وائلڈ کی خوبصورت نثر کی گرویدہ تھیں۔ وہ آرٹستانی ادیب کو ڈنر پر مدعو کرنا چاہتی تھیں لیکن آسکر بھی بلا کا طناز تھا۔ ہر دعوت کا جواب جھلاہٹ سے دیا کرتا۔ کہلا بھیجتا کہ میں انگلستان کی ملکہ کے ساتھ اس وقت تک ڈنر نہیں کروں گا جب تک انگلستان فرانس سے نیپولین کے حملے کی معافی نہیں مانگ لیتا۔ اور وہ صرف اس لئے کہ فرانسیسی خوبصورت نثر لکھتے ہیں اور انگریز اس میدان میں فرانسیسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیسے لوگ تھے اور کیسا ملک تھا۔ جہاں یہ نخرے ممکن تھے۔ ہمارے وقت کے بیشتر بقول خد "روحانی لوگ" بھی انکساری کی دولت سے محروم ہیں اور اپنے رویوں میں جاگیردارانہ FEUDAL انداز رکھتے ہیں اگر یہ لوگ پرائیویٹ جیل خانے نہیں بنا پائے تو پھر پرائیویٹ جہنم ہی سہی۔ لطف یہ ہے کہ یہی حضرات ان جنتوں کے دروازوں پر سنتری بنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

ضمیر جعفری صاحب سے پہلی ملاقات کراچی کے مشہور و معروف صنعت کار و بزنس مین جناب فضل حسن مرحوم کے گھر ہوئی تھی۔ وہ محمد حسن عسکری، سلیم احمد مشتاق احمد یوسفی اور ضمیر جعفری کا اکثر ذکر کیا کرتے۔ مجھ ناچیز سے بھی بہت محبت کرتے تھے ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو اچھی تحریروں کے نمونے سنایا کرتے تھے۔ ضمیر جعفری نے اپنے مضمون میں میرے اور ان کے مابین خلوص اور دوستی کے رشتہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جسے زیر بحث لانے کا یہ موقع نہیں۔ ضمیر جعفری صاحب سے میں نے فضل حسن مرحوم کے معیار پسندیدگی کی بابت سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ اچھی نثر پنگ پنگ کی گیند کی طرح کبھی ادھر اور کبھی ادھر نہیں ہوتی بلکہ سچی شاعری کی طرح دل پر راست اثر کرتی ہے۔ ضمیر جعفری کی نثر کا بھی یہی حال ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کہ وہ سادہ، سلیس، برمحل اور موثر نثر لکھنے پر اس طرح قادر ہیں جس طرح وہ دوسروں کی دلگیری کے کام میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ مزاح لکھتے وقت بعض مزاح نویس حضرات کی طرح کسی محاذ جنگ پر نہیں ہوتے بلکہ آپ سے سرگوشی کے لہجہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ آپ کے ہنسنے کی رفتار ان کی آہستہ خرامی سے ہمیشہ زیادہ رہتی ہے۔ ضمیر جعفری کے مزاح کے لئے کسی قسم کے فلیچر ازم (FLETCHERISM) کی ضرورت نہیں۔ آہستہ آہستہ چبانے کے عمل کی ہے۔ تاکہ مزاح نگار کے جملہ کا لقمہ معدہ تک پہنچتے پہنچتے دودھ کی طرح سیال بن چکا ہو بلکہ آپ ان کا مزاح مومن کی میراث کی طرح راستہ میں پڑا ہوا پائیں گے، جھکیے سے اٹھیے اور چلتے بنئے۔

ضمیر جعفری متعدد نثری کتابوں کے مصنف ہیں- بطور خاص "اڑتے خاکے" اور "کتابی چہرے" وغیرہ وغیرہ لیکن یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی تک اپنی "نثر" کی انفرادیت سے واقف نہیں ہیں ورنہ وہ بدستور اچھی نثر نہ لکھ پا رہے ہوتے- معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر جعفری نے انگریزوں سے عکسری تربیت کے ساتھ ساتھ نثر کے بارے میں ROYA L SOCIETY کی مخصوص ہدایات پر بھی عمل کیا ہے وہ جس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس علاقہ کے بیشتر ادباء اردو زبان کو بہت ذمہ داری اور کفایت لفظی کے ساتھ استعمال کرنے کے عادی ہیں- شاید اس طرز ادا کی ایک وجہ جعفری صاحب یہ بتائیں کہ عساکر برطانوی ہند اور پاکستان میں بڑی تعداد میں شامل ہونے کی وجہ سے حکمنامہ امروز (ORDER OF THE DAY) کی طرح رائل سوسائٹی (ROYAL SOCIETY) کی طرف سے اجراشدہ اچھی نثر کے لئے ہدایات پر عمل درآمد ضروری خیال کیا گیا ہے- اس صورت حال سے اس قدر فائدہ ضرور ہوا کہ اردو نثر اور نظم بھی تنظیم (DISCIPLINE) کے تابع ہو گئی- ہوتا آرہا ہے کہ جو بات پہلے DISCIPLINE کے طور پر اختیار کی جاتی ہے وہ کچھ عرصہ بعد عادت اور پھر مخصوص طرز ادا بن جاتی ہے-

ناروے کے سفر میں ضمیر جعفری صاحب کی شخصیت کے بعض ایسے رخ سامنے آئے کہ اگر یہ سفر ہماری مشترکہ یادوں کا امانت دار نہ ہوتا تو ضمیر جعفری صاحب کی زندگی کے کتنے ہی گوشے مجھ پر منکشف نہ ہوتے- ناروے کے پاکستانی میرے خیال میں نوے فی صد کے لگ بھگ سید ضمیر جعفری کے خاندان کے مرید یا ان کے حلقۂ متاثرین میں شامل ہیں- مجھے یوں لگتا ہے کہ ان سمندر پار پاکستانیوں کا بس چلے تو فرط محبت سے ضمیر جعفری کو ناروے میں زندہ ہی دفن کر دیں-

انگلستان میں بھی یہی نظر آیا میرے خیال میں اب شاعروں کو اپنے قارئین کے ساتھ ساتھ مریدوں کا حلقہ اثر رکھنا چاہئے- لیکن ضمیر جعفری صاحب کو ہمیشہ اپنے ہی حال میں مست دیکھا وہ مریدوں کی عقیدت بھی کمال کفایت ہی سے وصول کرتے رہے- وہ ایک درد مند انسان ہیں اور اس لئے ان کی نثر و نظم دونوں میں بڑی برکت ہے- انہوں نے بہت لکھا ہے لیکن اگر وہ کچھ بھی نہ لکھتے تو صرف "جزیروں کے گیت" "مافی الضمیر" "اڑتے خاکے" اور "کتابی چہرے" ہی ان کی عظمت منوانے کے لئے کافی قرار پاتے- انہوں نے میاں محمد بخش کی "سیف الملوک" کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے- ایک نثری ترجمہ ہمارے دوست شفیع عقیل نے بھی کیا ہے اور اسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے ایک ترجمہ "من کے تار" کے نام سے سلطان العارفین سید محمد شاہ کی ابیات کا ترجمہ ہے اور یہ دونوں بڑے کام ہیں- لیکن اگر مجھ سے کہا جائے کہ ان کی شاعری کا بنیادی وصف کیا ہے تو میں صرف اس قدر کہوں گا.... جذبہ کی تہذیب' خوبصورت تمثال گری' روایت اور رویات کا حسین امتزاج' مزاحیہ شاعری سے نقد زندگی اور سنجیدہ شاعری سے تہذیب زندگی کا ایک ایسا مہتم بالشان کام جو ساٹھ سال سے جاری ہے وہ بلاشک و شبہ اردو زبان کے ایک بہت ہی ہمہ جہت اور ہر فن مولا ادیب ہیں- وہ اور ممتاز مفتی بہ اعتبار عمر سینئر ادباء میں شمار ہوتے ہیں- ممتاز مفتی صرف فکشن سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ ضمیر جعفری صحافت' ادب' شاعری' کالم نویسی' ڈراما' خاکہ نگاری وغیرہ وغیرہ کے شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں- حد تو یہ ہے کہ وہ اس عمر میں بھی ماشا اللہ مشاعروں کی صعوبتیں جھیلتے ہیں اور اپنے میزبانوں کو ان صعوبتوں کے بارے میں پتہ تک نہیں ہونے دیتے- ضمیر جعفری کی ذات اور ان کی شاعری میں بھی یک گونہ مطابقت ہے- اس ذات میں شاعری کی کارفرمائی.... اور ان کی شاعری میں ذات کی کرشمہ سازی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں- میں نے جعفری صاحب کو بہ حیثیت قاری' سامع' دوست' علم اللسان کے طالب علم' علاقائی زبان کے ادب کے رسیاء لوک ادب کے شناور اور ملکی معاملات کے بارے میں ایک CONCERNED CITIZEN کے طور پر دیکھا ہے انہیں ان کے مکان کے کچن میں اور اپنے گھر میں ایک بزرگ خاندان کے طور پر دیکھا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حقیقی آرٹسٹ کے لئے زندگی اور آرٹ دو الگ الگ دنیائیں نہیں ہوتیں- میں نے انہیں ایسی صحبتوں میں بھی دیکھا ہے جن کا ذکر لطف سے خالی نہ ہونا چاہئے لیکن بہرحال اس ذکر میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آئیں گے اور ہرچند میرے بیان کے اختصار پر ان کی معصومیت میں بھی کچھ اضافہ ہی ہو گا لیکن مبادا لوگ معصومیت کے متعین معنی کو بھی "اضافی" سمجھیں اس لئے ان صحبتوں کا ذکر موقوف کیا جاتا ہے- فی زمانہ بعض نقادان فن لسانی حرمتوں کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور صرف ان نقادوں کے خیالات کی ترویج میں مصروف ہیں جو آسمانی کتابوں تک کے متون کو حتمی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں- میں نے ضمیر جعفری کو اب سے پہلے ان کی شاعری کے ذریعہ جانا مجھے یوں لگا کہ وہ شاید میرے ہی لئے شاعری کر رہے ہوں- ایک طرف مجاز' جذبی اور فیض احمد فیض کی شاعری تھی

اور دوسری طرف ضمیر جعفری صاحب کی ہلکی پھلکی شاعری کیا میں اعتراف کروں کہ مجھے مزاحیہ شاعری محض اس لئے پسند تھیں کہ فیض کی رومان پرور فضا کے بعد ذہن یکسر مختلف صورت حال کا بھی طالب ہوتا ہے۔ ضمیر جعفری صاحب میری نوجوانی کے دنوں میں اپنی شاعری کے بارے میں میری تشنگی بجھا نہ پائے اس حقیقت میں کیا کلام ہے کہ جب میں اسکول میں تھا تو اس وقت شاعری محض شاعری نہ تھی زندگی گزارنے کا ایک انداز بھی تھی۔

اس زمانے میں ترقی پسند شاعروں کا ڈنکا بٹ رہا تھا مجھے اس مکتب فکر کی شاعری کی یہ ادا بہت بھائی کہ شاعری یا ادب سے سماج کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ قاری اور خارجی عوامل ہماری سائیکی پر اثر انداز ہو چکے تھے۔ انگریزی سامراج کے بھی اثرات ملاحظہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں کا یہ دعویٰ کس قدر سچا تھا۔ زندگی ہمہ دم تغیر کا نام ہے اور زندگی میں تبدیلیاں بسا اوقات تحریری طور پر در آتی ہیں۔

جب میں نے ہم عصر شعراء کا مطالعہ شروع کیا تو میری نظر سے ضمیر جعفری کی شعری تخلیقات بھی گزریں۔ مجھے ان کی زبان اور بیان میں ایک انفرادیت نظر آئی اور وہ یہ کہ ان کی زبان باریک سے باریک مفہوم ادا کرنے پر قادر تھی ان کا سب سے پہلا شعری مجموعہ جو میری نظر سے گزرا وہ "جزیروں کے گیت" تھا۔ مغربی شاعروں کے اثرات کے تحت نظم معریٰ، نظم آزاد، اور سونیٹس SONNETS وغیرہ سامنے تھیں۔ بعض تخلیقات پسند بھی آئی تھیں۔ سید ضمیر جعفری نے کمال ہی کر دیا۔ کیا یہ کمال نہیں کہ انگریزوں کی فوج کا ایک نوجوان افسر جاپانی فاشزم سے مقابلہ کرنے ملایا پہنچے اور وہاں سے ملائی زبان کی صنف سخن پنتون (PONTON) سے اس قدر متاثر ہو کہ وہ وہاں سے یہ صنف سخن لے آئے اور اسے اردو کے قالب اور پنجابی ابیات کی روح میں اس طرح ڈھال دے کہ پنتون کا تعلق پوٹھوہار سے قائم ہو جائے میرے خیال میں تو اس کمال پر انہیں جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے اس کتاب پر چراغ حسن حسرت نے مقدمہ تحریر کیا تھا اور یہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ضمیر جعفری کی پنتون کے تراجم نے کچھ اس قدر ذہنی تعلق پیدا ہوا کہ انہوں نے اکثر و بیشتر پنتونوں کی سطروں میں بے ربطی کو پوٹھوہار کے گیتوں میں موجود "گھلاوٹ" کو شامل کر کے ایک نئی زندگی دے دی۔ یوں لگتا ہے کہ پنتون کی صنف سخن کسی زمانے میں پوٹھوہار سے بلکہ خاص طور سے "سیف الملوک" کے خالق کی سرزمین سے تعلق رکھتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ضمیر جعفری پہلے شاعر ہیں جنہوں نے پنتونوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ضمیر جعفری فوجی بینڈ کی موسیقی اور خاص طور پر SCOTISH BALLAD کے خاصے عاشق رہے ہیں اس لئے انہوں نے اردو شاعری کو بڑی عالیشان IMAGERY سے مالا مال کیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں!

"پنتون ملایا اور انڈونیشیا (بطور خاص جاوا) کی شاعری میں اظہار خیال کی مقبول ترین صنف کا نام ہے آپ اسے ایک قطعہ یا رباعی سمجھیں جس کا پہلا مصرعہ چوتھے کا اور دوسرا تیسرا مصرعہ آپس میں ہم قافیہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی کڑی بندھی ٹکی پابندی نہیں بعض اوقات قافیہ سرے سے لایا ہی نہیں جاتا محض صوتی... ہم آہنگی سے کام چلایا جاتا ہے۔ پنتونوں کا بڑا ذخیرہ دراصل لوک گیتوں پر مشتمل ہے جن کا نہ کوئی مصنف کسی کو معلوم ہے اور جو علمی حیثیت سے مرتب ہیں نہ محفوظ۔"

(اب یہ بات ترمیم چاہتی ہے۔ ملایا اور انڈونیشیا نے اپنی زبانوں اور ادب کی تخلیق میں بے مثال کام کر دکھایا ہے۔)

ضمیر جعفری نے پنتون کو پنجاب کے ماہیا اور سرحد کے ٹپوں کے آہنگ سے ملا دیا اور کمال ہی کر دیا۔ پنتون اور ماہیا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پنتون کے چار مصرعوں میں وزن یا قافیہ کی شرط نہیں ہوتی۔ ماہیا کا پہلا مصرعہ آدھا ہوتا ہے جس کا دوسرے مصرعے سے بہ اعتبار معنی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سید ضمیر جعفری کا تخلیق کردہ ایک پنتون ملاحظہ کیجئے۔

بعد مدت آج بنت عم تری یاد آگئی
جیسے گھر جائے اچانک بانس کے جنگل میں آگ
جیسے مایوسی میں لب پر "دفعتاً" آجائے راگ
یا کوئی مچھلی سنہری دھوپ میں لہرا گئی

ایک اور پنتون

کہتی ہیں یہ فراق کی تنہائیاں مجھے
عالم جو بن گیا ہے مٹایا نہ جائے گا
بے ہوش ہو کے ہوش میں آیا نہ جائے گا
اب راس آچکیں مری رسوائیاں مجھے

یوں لگتا ہے جب ضمیر جعفری "جزیروں کے گیت" لکھ رہے تھے تو ان کے کانوں میں سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ کے ابیات بھی گونج رہے

تھے جنہیں وہ اپنی والدہ سے بچپن میں سنا کرتے تھے۔ پیر سید محمد شاہ اور سیف الملوک والے میاں محمد بخش کے مابین اکثر و بیشتر مغالطہ (CONFUSION) ہو جاتا ہے اول الذکر سید تھے اور آخر الذکر سید تھے اور نہ "ہیر" کے خالق۔ اب آپ سید محمد شاہ کی ایک دو ابیات بھی سنئے تاکہ ضمیر جعفری کے پنتون پر بچپن میں سنے گئے ابیات کے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

میرا مان اور میری مایا' سائیں نظر تمہاری
میں بے گری اور گن ہاری میں پاگل مت ماری

○

گھوڑے پر گاہک آئے تو بچھ بچھ خاطرداری
دام نہیں تو در کیوں کھولیں' تف کنجروں کی یاری

○

محل' منارے' چراغ' چوبارے' مسجد' کلس' شوالے
پتھر چومنے سے بھی پہلے سوچیں سوچنے والے

○

پُروا پونچھ سے آئے تو یہ سمجھو بادل برسے
نیلے پیلے موتی رنگوں سے پھر یہ جی کیوں ترسے

یہ مندرجہ بالا ابیات پیر سید محمد شاہ کی ابیات کے تراجم بہ عنوان "من کے تار" سے لئے گئے ہیں اور ان ابیات کا ترجمہ بھی ضمیر جعفری صاحب ہی نے کیا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ ۱۹۴۵ء میں ضمیر جعفری کے "جزیروں کے گیت" کے پنتون ۴۰ سال بعد شائع ہونے والے سلطان العارفین کے "ابیات" سے کس طرح فیض اٹھاتے ہیں۔

ضمیر جعفری پوٹھوہار کے اس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے برصغیر کی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ تحریک مجاہدین میں پوٹھوہار کے گکھڑ GHAKKAR سرداروں کا اہم کردار رہا ہے اور سید احمد شہید نے گکھڑوں کے سردار راجہ جہانداد خاں کے نام بھی خط لکھا تھا اور انہیں دعوت جہاد دی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ سکھوں نے پوٹھوہار کے مسلم عوام پر جس نوعیت کے مظالم کئے ہیں وہ اس درجہ روح فرسا ہیں جس قدر بھاولپور' ملتان' مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خاں کے عوام پر اور اس طرح کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے کہ ان تمام روایتوں کے باوجود رنجیت سنگھ کس طرح برطانوی ہند کے جغرافیائی پنجاب کا ہیرو ہو سکتا ہے۔ جب کہ سکھ دور کے اوائلی زمانے میں گکھڑوں کے سر کی قیمت ایک روپے مقرر کی گئی تھی۔ پوٹھوہار کے لوک گیت سکھ دہشت گردی کے خلاف پرسوز نوحے بھی ہیں۔ اس علاقہ کی ادبی روایت فارسی اثرات سے شروع ہوتی ہے۔ اسی علاقہ میں شاہجہان کے دور میں اردو کا پہلا شاعر شاہ مراد پیدا ہوا۔ یہ علاقہ صوفی شعراء کے لئے بطور خاص راس رہا ہے۔ سید ضمیر جعفری کے جدامجد حضرت سید محمد شاہ کی "ہیر" اور "ابیات" سے پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی عشق رسول میں ڈوبی ہوئی نعتیں' احمد سائیں اور ہمارے دور میں سید ضمیر جعفری اور باقی صدیقی نے اسی شعری روایت کی پاسداری کی ہے جس میں محبت کی سرمستیاں اور صبر و سکون اور قناعت کی لوریاں بیک وقت نظر آسکتی ہیں۔

ضمیر جعفری متعدد شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ "کارزار"۔ "لہو ترنگ"۔ "جزیروں کے گیت"۔ "مافی الضمیر"۔ "میرے پیار کی زمین"۔ "ولایتی زعفران" (انگریزی نظموں کا ترجمہ) "من میلہ"۔ "متاع ضمیر"۔ "زبور وطن"۔ مسدس بدحالی وغیرہ وغیرہ مجھے ان کی طویل مثنوی "گنر شیر خان" بطور خاص پسند ہے۔ یہ SCOTISH BALLAD کے انداز میں تحریر ہوئی ہے اور اگر کسی اردو مثنوی پر انگریزی بلکہ SCOTISH اثرات دیکھنے ہوں تو "گنر شیر خاں" کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ ضمیر جعفری زیادہ تر ایک مزاح نگار شاعر اور نثار کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جب کہ وہ ایک سنجیدہ غزل گو بھی ہیں۔ مثلاً ان کے مندرجہ ذیل اشعار۔

پایانِ شب سراغِ سحر بھی نہیں رہا
منزل تو کیا ملے گی سفر بھی نہیں رہا
یہ بے حسی کہ جیسے رگوں میں لہو نہ ہو
یہ بے دلی کہ موت کا ڈر بھی نہیں رہا
جس میں کبھی کبھی اتر آتی تھی چاندنی
دیوار میں وہ روزنِ در بھی نہیں رہا
تقدیس آرزو کے بغیر آرزو عبث
دستار گر گئی ہے تو سر بھی نہیں رہا

سید ضمیر جعفری برطانوی اور پاک افواج کے لئے سید ضمیر حسین شاہ کے نام سے ملازمت کے رجسٹر پر رہے۔ وہ جنگ عظیم

اول کے زمانے میں چار پانچ سال کے بچے تھے اور اب ۷۹ سال کے جوان ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ان کا جوانی اور جولانی سے نکاح ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری تخلیقی ناآسودگی CREATIVE DISSATISFACTION کے جذبات سے مملو ہے اور یہ ہنر بھی صرف اس شاعری کو راس آسکتا ہے جس کی آنکھیں اپنے سماج کے لئے روشن مستقبل پر لگی ہوئی ہوں کہ ناآسودگی کے احساس سے تعمیر و تشکیل کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ سید ضمیر جعفری کی شاعری اس مخصوص احساس ناآسودگی کی شاعری ہے۔

اسلام آباد میں ایک غیر ملکی سربراہان مملکت کا استقبال کرتے ہوئے

عزیز ملک اور جعفر طاہر کے ہمراہ ۱۹۵۸ء

Zamir Jafari — a frontline humorist

Ghulam Jilani Asghar

Zamir Jafari is a delightful literary phenomenon. From elegy to eulogy, every form is grist to his creative mill. He is a wonderful companion — the soul of discretion and essence of bonhomie. If he had born in the days of Akbar the Great, he would have replaced Birbal and Faizi. In fact, the whole caboodle of them. He would have been equally at home in the impoverished Darbar of Bahadur Shah Zafar, who had a regular poet laureate.

Historically speaking, Zamir stands at the crossroads of tiem. He loves the past, respect the present and lives in the future. "I am Father Time", he would tell you with a mysterious leer on his lips, and you would readily believe him. His humour, with a strange passion for life, has made him indestructible.

Zamir Jafari is an old chum in the most intimate sense of the word. We were together for quite a number of years. A well-appointed room (with borrowed chairs and a wardrobe) on the first floor of the Rivaz Hostel had become the centre of literary activity. Tabish Siddiqi, Mukhtar Siddiqi and many other poets who were striving for expression would instinctively gravitate to the room which had plenty of laughter and tea. Riwaz is still alive in one of his most engaging, parodies:

جہلم و چناب کے خاصان طرہ باز دیکھ
اس کی زلف سنبلیں، اس کی نگاہ ناز دیکھ
ان کے حجروں میں کتابوں سے زیادہ ساز دیکھ
گت پہ طبلے کی ریاضِ علم کے انداز دیکھ
ہر کوئی رانجھا کسی اپنی خیالی ہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے رِواز کی تصویر کا
تنگنائے "کیوبکل" میں شاعروں کا اک ہجوم
پچھلی دو صدیوں کے مستقل تخلص بالعموم
ان کے شعر تر کی ہے پورے عرب ہوٹل میں دھوم
ان کی صورت دیکھ کر میں جھومتا ہوں تو بھی جھوم
کچھ ہنر ہے تاجور کا کچھ اثر تاثیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے رِواز کی تصویر کا

The poem, written i n1938, not only brings into sharp focus the life of careless sociabilitv in a college hostel, but also brings the laughable side in the forefront. Zamir was trying his hand at parody which would give him a step in the peerage, but he had to discover his real metier, which was humour springing from the oddities of life Zamir soon discovered it. In 1943, when he wrote "A visit to a Picture House "(*Mujhe Zauq-i-Tamasha Ley Gia Tasvir Khano Mein*) his observation of everyday become much more subtle. Now he could take a detached view of things and reveal those features of life which are undenitably pleasing. The facets of the

social milieu which he has underlined in his poems have petained their freshness and hilarity in spite of the passage of time. If we visit a picture house today (44 years have passed since this poem was written), our experience is exactly the same as it has been verbalised by the poet:

جو پکچر میں ذرا سا بھی وصال یار ہو جائے
تو اہل دل کو پوری زندگی دشوار ہو جائے
کبھی رقص مسرت میں، کبھی جوش رقابت میں
براہ راست سب شامل ہیں ہیرو کی محبت میں
ہیروئن بھی پرائی مہماں معلوم ہوتی ہے
بسا اوقات تو ہیرو کی اماں معلوم ہوتی ہے

Zamir uses the art of parody to laugh at the common-sense opinions, but he is primarily a humorist with a dominant note of satire which lends the charm of contemporaneity to his verse. Perhaps no other poet of his class has registered the changing moods and opinions of his time so perfectly. Normally such verse (it includes notions and opinions which have been formed without careful reflection and criticism) appears ephemeral or dated as it happened to the satirical verse of Akbar Allahabadi. The issues that figured so prominently in Akbar's times have lost their urgency with the change in the social and political climate. Therefore, much of his verse has lost most of its flavour. For example, read these verses which can only be understood in the light of the Non-co-operation Movement. If we are not familiar with that phase of our constitutional struggle, we are unable to realise the terrific impact of these lines:

اک غلغلہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا
گاندھی ہے گو۔ آدمی وہ علی تو نہیں ہے
گجرات ہی کی بات ہے۔ کابل تو نہیں ہے
(اکبر)

Akbar was too much engrossed in his own age. He could not see beyond it. He was not particularly interested in a complex and rapidly changing world. Like P.G. Wodehouse, he was taken up by the social and political phenomena of a degenerating society faced with new challenges. As such, his satire failed to cope with new and unfamiliar situation.

Zamir, on the other hand, in spite of his sensitiveness to the social and political concerns of the last 50 years, has retained a freshness which is almost unique. The reasons are quite obvious. He does not laugh at a person or an institution which is at odds with the normal behaviour of society. He exposes those features of human nature which are laughable for their built-in inconsistencies. They are not peculiar to any individual, but to the entire class. This makes his satire pleasing and charitable. His intimate association with the

everyday drama of life has made him a social critic with a difference. He takes a detached view of things like "talkies, their absurd plots and acting, overcrowded buses and inhospitable passengers, bad roads; beggars and quacks". But it is his remarkable sense of observation and love for the smallest detail that makes his satires penetraing. Here are some of the examples:

ہر نفس اک تازہ تر الجھن کو سلجھانا پڑا
آدمی گھر میں ہے یارب یا کسی تھانے میں ہے

میں بتاتا ہوں زوال اہل یورپ کا پلان
اہل یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

یہ کتب جن کے کھل جانے سے آنکھیں بند ہوجائیں
یہ دانش؟ جس کے آجانے سے بیکاری نہیں جاتی

تھی ابھی لرزاں فضاؤں میں ہی بانگ اتحاد
ہو گیا مرغوں میں برپا ایک انڈے پر فساد

Human nature with its in-built oddities, as I suggested, has a universal penumbra of genuine and refreshing humour. Zamir always succeeds in bringing this aspect into focus. But his satire is without any vitriolic sense of ridicule. His humour is humane. Zamir, like all great humorists, knows that life as it is, is made of many irreconcilable poles. In fact, the discovery of this oddity and living with it makes the charm of life. A lesser man, wihtout any sense of humour, is overwhelmed by this. A humorist, on the other hand, laughs at the inadequacies— his own and those of others.

Rare gift

Zamir's humour is not entirely externally directed, as it happens in the case of satirists. His attitude towards life is one of the intimate participation. And since he is a part of the reality he surveys, he has like all genuine humorists "the rare gift of turning his laughter on himself". Some of the finest verses in Zamir's *Mafizzamir* (better read the revised edition) give off an encouraging glare of one-dimensional self-assessment. He laughs at himself with the same abandon that he has used for other laughable characters in his longer poems.

مجھ سے مت گھر کا پتہ پوچھو کہ جوش اشک سے
آج کل بندہ کوئی چھ سات دریاؤں میں ہے

دل کے بے ترتیب و گرد آلود دفتر میں ضمیر
یاد ان کی اب نہ جانے کون سے خانے میں ہے

ان کا دروازہ تھا مجھ سے بھی سوا مشتاق دید
میں نے باہر کھولنا چاہا تو وہ اندر کھلا

جان محفل تھا خدا بخشے ضمیرا
اب تو اک مدت سے شوہر ہو گیا

ان کے پھاٹک میں یوں کھڑے ہیں ہم
جیسے ہاکی کے گول کیپر ہیں

This fascinating self-assessment imparts a rare charm of human sympathy to his humour. It raises him above the narrow embience of a social critic or a satirist and places him in the frontline of great humorists. One would like to say about him what Anatole France said about Voltaire: "In Zamir's fingers the pen runs and laugh."

نعت سرور کونینؐ

نبیاں دا سرتاج محمدؐ اُچیاں شاناں والا
رات گئی، نوری دن چڑھیا، جگ جگ جگ اُجیالا

نام محمدؐ، سرور عالمؐ، موتی، سوہنا، سچا
جو اس در تے رنیواں ہویا، اوہو سب توں اُچا

آپؐ آئے تے، چن تارے دی بند حویلی کھلی
نجراں دھمیاں، نہراں چلیاں، وا باغاں دی جھلی

امن سلام دی وکشاوندی، توں جیوں، میں جیواں
ہک مالا انسان پروے، ناں کوئی اُچا نیواں

مسکیناں دے اتھروں پونجھے، حق وتا ہمشیراں
بندے، بندی دانوں نکلے، ٹٹیاں سب زنجیراں

اوہدی پاک حیاتی اندر جگ تگ دی سرداری
ہر تھے وچ چانن اُسدا، ہر مٹی پھلواری

جیو کیہا! میاں محمد صاحبؒ گن نئیں میرے پلے
پر جے ویکھاں تیرے ولے، بلے، بلے، بلے

○

دُعا

(سروجنی نیڈو کی ایک نظم سے ماخوذ)

پیشواؤں اور پیغمبروں کو
اُن کی تعلیمات مبارک
بادشاہوں اور اُن کے مصاحبوں کو
اُن کی وجاہت مبارک
مغلوب کو اُمن
فاتح کو طاقت
اے خدا مجھ کو نغمے کی شیرینی عطا کر

○

امام غزالیؒ کے مزار پر

اے غزالیؒ اے غزالِ حکمتِ دُنیا و دیں
تیرے مرقد پر مجھے لے آئی ہے میری جبیں

تُو نے اُجلایا تخیّل تُو نے چمکائی زمیں
نطق سے تیرے یہ گورستان گفتار آفریں

بولتا ہے پتھروں میں تیری منطق کا یقیں
موجِ دریا کیا ہے تیرا ایک حرفِ دلنشیں

جس میں تُو بیدار ہے یہ لعل ور دامن زمیں
اس طرح بیدار ہے جیسے کبھی سوئی نہیں

سلمان فارسیؓ کے مزار پر

دیدنی ہے رقصِ روح و جسم و جاں اب بھی یہاں
عشق ہے خاقان و سلطانِ جہاں اب بھی یہاں
عاشق سلطان ہفت عالمؐ کا یہ مرقد منیر
جُھک کے ملتا ہے زمیں کو آسماں اب بھی یہاں

حضرت پیر سیّد محمد شاہؒ کی نذر

پتھر تو سرکائے گا وہ جس نے ٹھوکر کھائی ہوگی
مقروضوں کے شہر میں آخر سیٹھوں کی رسوائی ہوگی

جگ کو جگمگ کرنے والی ہر ندی ہرجائی ہوگی
جس پانی سے نہر نہ نکلے اُس پانی پر کائی ہوگی

رشتے باہم بڑھتے ہیں کم چلنے والی گلیوں میں
شہر میں جتنی بھیڑ بھرو گے اُتنی ہی تنہائی ہوگی

اُس کے میووں کا رس چکھا، اُس کے رُوپ کا رنگ انوکھا
جو کھیتی دریائی ہوگی — جو لڑکی صحرائی ہوگی

صحن میں باندھے ہرن کے بچے سے بے شک گھر سج گیا تیرا
یہ نہیں سوچا دشت میں ماں ہرنی کتنی گھبرائی ہوگی

آج اچانک دل ویرانے میں خوشبو بارائیں کیسی؟
کوئی آنچل لچکا ہوگا — زلف کہیں لہرائی ہوگی

○

زندگی دریوزہ دامن ہے ابھی
اس بھرے بازار میں بَن ہے ابھی

کب ہوا ہے رام کا بَن باس ختم
تاک میں سیتا کے راون ہے ابھی

کِشت دہقاناں وہی بے آب و نم
قصرِ سُلطاناں پہ ساون ہے ابھی

گاؤں کی گلیاں نہ اینٹوں سے چُنو
ان گھروں میں میرا بچپن ہے ابھی

تیرا آنچل جن میں ڈھلکا تھا کبھی
اُن خرابوں پر بھی جوبن ہے ابھی

آؤ ڈھونڈھیں شہر میں اُس شخص کو
جس میں کچھ بے ساختہ پن ہے ابھی

کیا کرشمہ ہے کہ یہ بوڑھی زمیں
بیوگی میں بھی سہاگن ہے ابھی

عام جلسوں میں ہُنر کے فیصلے
کس قدر ناقدریٔ فن ہے ابھی

○

خوش خیالی نے کبھی چھوڑا نہیں تنہا مجھے
دشت میں آواز دیتا ہے کوئی صحرا مجھے

دل میں کیا کیا تھا، مگر خنجر کفِ قاتل میں تھا
لب پہ کب آیا مرے جو کچھ نظر آیا مجھے

میرے بیٹے تجھ کو کیا تاکید کر سکتا ہوں میں
تُو نے دیکھا ہے محاذِ جنگ سے پسپا مجھے

ڈھونڈھتا ہوں گاؤں کی مٹی کی دیواریں یہاں
شہر تو اینٹوں کے اک مرگھٹ میں لے آیا مجھے

تُو نے یا رب ضبطِ غم کی کس قدر توفیق دی
خانداں والوں نے بھی سمجھا ہے سرکردہ مجھے

تجربہ یہ تھا کہ محرومی تھی اِک اِک موڑ پر
واقعہ یہ ہے پسند آئی بہت دُنیا مجھے

غنچہ و گل کی سخاوت تو بہت مشہور ہے
خار و خس نے بھی مگر زیور دیئے کیا کیا مجھے

سرسید احمد خاںؒ

اُس نے جانچا وقت کی بپھری ہوئی رفتار کو
اُس نے تھاما قوم کی گرتی ہوئی دیوار کو

یاس کے گہرے سمندر میں کنارا بن گیا
وہ ہماری رات کا پہلا ستارا بن گیا

تھا رُخِ حالات پر جب زرد پردہ گرد کا
چارہ گر اسلامیانِ ہند کے دُکھ درد کا

زندگی کا بار دِر اسلوب سمجھایا ہمیں
خودکشی کی آخری حد سے بچا لایا ہمیں

لفظ کا نم، ذہن کا رَم جاننے والا تھا وُہ
روز و شب کی نیتیں پہچاننے والا تھا وُہ

اُس نے سمجھایا نئی آفاق بندی کا مزاج
زندگی دیتی نہیں بے علم قوموں کو خراج

پاک مٹی کی سنہری بالیوں میں اُس کا نام
کشتِ پاکستان کی ہریالیوں میں اُس کا نام

شاہیاں، آزادیاں، خودداریاں، خوش حالیاں
میرے خالی گھر میں کتنی نعمتیں بھر ڈالیاں

○

ساغر اُداس، حرف مقید، نوا خموش
کیا رہ گیا ہے شہر میں تعزیر کے سوا

بس اِک خیال ہی تھا خیابانِ زندگی
دُنیا میں کچھ نہ تھا تری تصویر کے سوا

مقتول کے لہو سے گلابی ہوئی زمیں
قاتل کے پاس کچھ نہیں شمشیر کے سوا

حریتِ ضمیر سے جینے کے واسطے
کیا راستہ ہے اُسوۂ شبیرؑ کے سوا

حاکم کے خوف سے تو غلامی ہوئی ضمیر
چھینے گا مجھ سے کیا مری زنجیر کے سوا

موجِ رواں

(علامہ اقبالؒ کے کلام و پیام کی نسبت سے ایک استعارہ)

نغمہ گر ــــــــــ نغمہ خواں
جاوداں ــــــــــ بے کراں
ایک رودِ کہستاں کی موجِ رواں
کتنی صبحوں کا سونا اُٹھا لائی ہے
کتنی شاموں کا جادُو جگا لائی ہے
کوہساروں کے سنگیں جگر کاٹ کر
نرم کلیوں کے گجرے بنا لائی ہے
جو ستارے تھے حدِ نگاہِ بشر
اُن ستاروں کے میلے سجا لائی ہے
جو بہاریں تھیں مقصودِ قلب و نظر
اُن بہاروں کی خوشبو اُڑا لائی ہے
ایک سیّال مستی کی دیوانگی
اپنی رَو میں چٹانیں بہا لائی ہے
ایک رازِ عیاں ، ایک سازِ جواں
نغمہ گر ــــــــــ نغمہ خواں
جاوداں ــــــــــ بے کراں
ایک رودِ کہستاں کی موجِ رواں
حُسنِ فطرت کی تفسیر کرتی ہوئی
ہر تصوّر کو تصویر کرتی ہوئی
ریگ زاروں کو توقیر دیتی ہوئی
کوہساروں کو تسخیر کرتی ہوئی
ذہنِ آدم کی تقدیس پڑھتی ہوئی
ظرفِ ہستی کی تطہیر کرتی ہوئی
کتنی صدیوں کی تقدیر بنتی ہوئی
کتنے خوابوں کی تعبیر کرتی ہوئی
سرد جذبوں میں شعلے پروتی ہوئی
زرد مٹی کو اکسیر کرتی ہوئی
ہر کنارے کی حد سے چھلکتی ہوئی
ہر ستارے کو نخچیر کرتی ہوئی
آگہی کی نظر ، زندگی کی زباں
ہر مکاں ــــــــــ ہر زماں
از کراں ــــــــــ تا کراں
نغمہ گر ــــــــــ نغمہ خواں
جاوداں ــــــــــ بے کراں

شیخ معروف کرخیؒ کے مزار پر

راستہ ہے کہکشاں درویش کا
آسماں ہے آستاں درویش کا
خندہ زن ہے فرّ کاخ و قصر پر
بے سر و ساماں مکاں درویش کا

زندہ جاوید

(قائداعظم کی وفات پر)

ہمارے دل میں جب تک شعلۂ ایقان زندہ ہے
ہمارا عہد محکم، عزم عالی شان زندہ ہے
ہمارا دین زندہ، دین پر ایمان زندہ ہے
ہماری زندگی ——— آزاد پاکستان زندہ ہے
ہمارا قائد اعظمؒ بہر عنوان زندہ ہے

جو منزل اُس نے سَر کی اور کوئی کر نہیں سکتا
دلوں میں اتنا اطمینان کوئی بھر نہیں سکتا
یہ کیسے مان لوں وُہ مر گیا جو مر نہیں سکتا
وُہ روحِ پاک زندہ وُہ عظیم انسان زندہ ہے
ہمارا قائد اعظمؒ بہر عنوان زندہ ہے

وُہ طوفانوں سے اُلجھا اور ساحل دے گیا ہم کو
وُہ محفل دے گیا، سامانِ محفل دے گیا ہم کو
خود اپنی آگ میں پگھلا ہوا دل دے گیا ہم کو
یہ جذبِ بیکراں طوفان در طوفان زندہ ہے
ہمارا قائد اعظمؒ بہر عنوان زندہ ہے

اجل بس اُس کے جسمِ ناتواں کو چھین سکتی ہے
فنا کی موج، مُشتِ استخواں کو چھین سکتی ہے
مگر کب اس کے جذبِ بیکراں کو چھین سکتی ہے
یہ جذبِ بیکراں طوفان در طوفان زندہ ہے
ہمارا قائد اعظمؒ بہر عنوان زندہ ہے

○

دشت میں رہ کر غزالوں کی طرح
کیا جئیں اب شہر والوں کی طرح

نیزے پسپائی میں بھی اونچے رہے
جیتنے والے رسالوں کی طرح

اب کہاں وہ مشعلوں والے حروف
جن کو ہم برتیں حوالوں کی طرح

دل میں یہ کچھ اجنبی چہروں کا عکس
صبحِ صحرا کے اُجالوں کی طرح

گاؤں کے گبھرو بھی دُھندلانے لگے
تیرے ریشم کے رمالوں کی طرح

کوئی نعمت خوش مزہ پائی نہیں
ماں کے ہاتھوں کے نوالوں کی طرح

ہم رہے شیشے کے گھر میں بھی ضمیر
گاچنی مٹی کے پیالوں کی طرح

لیلیٰ خالد

(تحریکِ آزادیٔ فلسطین کی نامور مجاہدہ)

تیری آزادی کے نغمے گائے گی
تیرے آنچل کی ہوا
تیرے خیموں پر گہر برسائے گی
تیرے ماتھے کی ضیا
تیرے مجبوروں میں لہو دوڑائے گی
تیرے ہاتھوں کی حنا
تیرے صحراؤں میں دریا لائے گی
تیری زلفوں کی گھٹا
تیری عظمت کا علم لہرائے گی
تیری آنکھوں کی حیا
ہر اُفق، ہر دَور، ہر تہذیب کی
روشنی بن جائے گی
موت پر تیرے جھپٹنے کی ادا

جب عشق کیا صحراؤں سے
کیا ڈرنا تیز ہواؤں سے

جب لفظ لبوں پر رل جائیں
زنجیر بجاؤ پاؤں سے

دُھنباد کہو ان کھیتوں کو
یہ شہر جوان ہیں گاؤں سے

فردا کے لئے کھنچوائی ہیں
تصویریں نابیناؤں سے

ذرّات کی نیّت ٹھیک نہیں
یہ کہہ دو قصر قباؤں سے

مانگو کچھ ظرف مروّت کا
لوگو پیڑوں کی چھاؤں سے

یہ شام یہیں رُک جائے گی
تم جھانجھر باندھو پاؤں سے

اَب اس سے کس کی مانگ بھریں
سیندور جلا بیواؤں سے

سمجھو کوئی طوفاں آئے گا
جب پیاس ملے دریاؤں سے

نذرِ انیسؔ

قلبِ گیتی مضطرب تیرے جہاں گر ساز میں
بولتا ہے وقت کا دریا تری آواز میں

تیرے غم محرم قلم سے تذکرہ شبیرؑ کا
اِک سنہرا سلسلہ انسان کی تطہیر کا

بے زباں الفاظ کو ، ذوقِ سخن تُو نے دیا
پیکرِ فن کو گلابی پیرہن تُو نے دیا

جبر، جس بہروپ میں ہو، جبر پر تنقید کی
آدمی کے ہر مقدس خواب کی تائید کی

تیرا اِک اِک شعر دردِ زندگی کی لہر ہے
آنسوؤں کی نہر پہ تو روشنی کا شہر ہے

خاتمِ فن ، فاتحِ لفظ و بیاں! تجھ کو سلام
اے کہ ہے تیری زباں ، میری زباں! تجھ کو سلام

درویش مرے سلطان مرے

(پارچہ بانی کے ہنر میں پاکستان کے مایۂ ناز فن کار سندھ کے
جناب رئیس عبداللہ ابڑو کے حضور)

میرا دُھن تیرا من تیرا فن اُبڑو
تُو تابش و تابِ وطن اُبڑو
جیون سوجھے فن کاروں سے
جیسے مسجد میناروں سے
رس رنگت میرے جینے کی
خیرات ہے تیرے پسینے کی
میری پت بھی تُو ، میرا پیار بھی تُو
میری "اجرک" تو ، دستار بھی تُو
برگ و بُستان ، قصر و ایواں
سب حرکت و برکت کار گراں
ترے دل میں عکس بہاروں کا
ترے ہاتھ پہ رقص ستاروں کا
تُو موتی اور مہتاب بنے
میرے پاک وطن کے خواب بُنے
"رِگھے" پر گیت اُتار دیئے
دھاگے میں چاند اُتار دیئے
ضَو بخشی اپنے ہاتھوں کو
کیوں چُوم نہ لوں اِن ہاتھوں کو
سادہ پہ دست کشادہ تُو
مری ہستی کا شہزادہ تُو
سَدا مَست تری خوشبو سائیں
سدا سکھ جیویں اُبڑو سائیں
ہرا سُر ساگر قربان ترے
درویش مرے ، سلطان مرے

○

بادشاہوں کو کہیں بے شک نظر آیا نہیں
کون سے رستے میں درویشوں کا گھر آیا نہیں

زندگی میں ایسا ہنگامِ سفر آیا نہیں
صبح ہے اور صبح کا تارا نظر آیا نہیں

اُس کے بال و پَر کو خاکِ وخس کی رسوائی ملی
جو پرندہ اُڑ سکا اور شاخ پر آیا نہیں

آدمی کی کوئی صورت آخری صورت نہیں
زندگی کا کوئی لمحہ لوٹ کر آیا نہیں

دوستو تفصیل اُس کافر کی چھب کی کیا کہیں
اس سا کوئی شخص اس سے پیش تر آیا نہیں

تتلیوں کے پَر پہ بھی کچھ حسرتیں تحریر تھیں
ہم کو اِس اِملا کے پڑھنے کا ہُنر آیا نہیں

سنگ پر حرفِ نمو لکھنا کوئی آساں نہ تھا
کون سا الزام دیوانوں کے سر آیا نہیں

ایک موجِ تہ نشیں، بے چین و آوارہ رہی
بحر میں آ کر بھی دریا اپنے گھر آیا نہیں

○

جہانِ نَو کی بنیاد اس طرح تعمیر کر جاؤ
کہ اپنا نام پہلی اینٹ پر تحریر کر جاؤ

کبھی دے جاؤ اِن رستوں کو اپنے پاؤں کی مہندی
کبھی اس شہرِ نامنظر کو بھی تصویر کر جاؤ

تمہارے پاس وہ جو اک طلسمی لمس ہے جاناں
مجھے چھُو کر مری اس خاک کو اکسیر کر جاؤ

تمہارے شعر اگر تلوار بن سکتے نہیں تم سے
تو اپنے فن کو اپنے پاؤں کی زنجیر کر جاؤ

فقط سانسوں کی گنتی ہی کو جینا تو نہیں کہتے
کوئی اک واقعہ تو قابلِ تحریر کر جاؤ

محبت میں وفا کے لفظ کا مفہوم مشکل ہے
مبادا تم کوئی آسان سی تعبیر کر جاؤ

سینائی کے سامنے

اے وادیٔ سینا!
تھی خاک تری دانش و حکمت کا خزینہ

گھر گھر میں چراغاں سرِ طور ہو جیسے
بلور پہ جلتا ہوا بلور ہو جیسے
ہر سنگ نگینہ
ہر دشت مدینہ
اے وادیٔ سینا!

آثار ترے نازشِ ایام جہاں میں
تو منبر و مینارۂ اسلام جہاں میں
سورج سا سنہرا تھا ترا نام جہاں میں
تو رنگ کا رسنا
تو علم کا زینہ
اے وادیٔ سینا!—

تحقیق کے موتی ترے افکار سے نکلے
بازار سبھی مصر کے بازار سے نکلے
تہذیب کے رخسار ترے نیل نے دھوئے
سب داغ زمانے کے اسی جھیل نے دھوئے
صحراؤں پہ برسا ترے ساون کا مہینہ
اے وادیٔ سینا!

کیوں تیری کھجوریں ہیں تہی برگ و ثمر سے
مدت ہوئی اس گرد پہ بادل نہیں برسے
آہو ترے مانوس نہیں راہ گزر سے
صحرا میں بگولے ہیں گھومتے گرداں کسی ڈر سے
کہسار کو کاٹا تھا ترے تیشۂ فن نے
دریاؤں کو روکا تھا کراماتِ ہنر سے
دھندلا ہے گہن میں تیرا ڈوبا ہوا سورج
ویراں ہے تیرے چاند ستاروں کا شبینہ
اے وادیٔ سینا!

کیوں شہر میں آتی نہیں اب آتشِ صحرا
کیوں نیل میں گاتی نہیں اب آتشِ صحرا
کیا ہو گئے اے قلزمِ احمر ترے طوفاں
نے رودِ خراماں — نہ کوئی موجِ غزلخواں
کب تک تیرے ساحل پہ غنیموں کے پھریرے
بن باس میں ہیں تیرے پرندوں کے بسیرے
کب سے ترے دروازے پہ زنجیر پڑی ہے
کب تک ترے بازار میں قزاقوں کے ڈیرے
کب تک تری بھیڑوں کو خریدے گا یہودی
کب تک ترے کھلیان کو لوٹیں گے لٹیرے
مغرب کے گلابوں میں ترے خون سے رونق
کیوں تیرے سمندر میں نہیں تیرا سفینہ!
اے وادیٔ سینا!

والدہ مرحومہ کی یادیں

اے پیکرِ مہر و وفا   اے مخزنِ صدق و صفا
تیرا طریق بے ریا   تیرا دلِ درد آشنا
ہر سانس میں نامِ خُدا   ہر گام پر صلِّ علیٰ
وُہ صبح گاہی کی دُعا   اشکوں میں بھیگی مامتا
وُہ آنسوؤں کا قافلہ   وُہ دھڑکنوں کا سلسلہ

میرے چراغِ رہ نما

مَیں جو بھی ہوں   جو کچھ بھی تھا
تُو ابتدا تُو انتہا   میری متاعِ دو جہاں

اے میری ماں

تجھ سے مرے آبا کا گھر

اِک محفلِ مسرور تھا   اِک قریۂ پُر نُور تھا
اِک آسمانی چاندنی   اِک مطمئن آسودگی
اِک خوبصورت سادگی   اِک بے کدُورت زندگی
پھُولوں سے بڑھ کر تازگی   کرنوں سے خوش تر زندگی
جیسے بھرے ساون سے   برکھا کی برسی شام کو
سَت رنگ پاکیزہ دھنک   اپنے چراغوں کو لئے
میداں سے اُٹھ کر دُور تک   اُونچے پہاڑوں پر چلے
اور وقت سستانے لگے   برگد کی محرابوں تلے

یہ نعمتیں یہ راحتیں

یہ عزّتیں یہ شہرتیں

دُنیا میں جو کچھ بھی ملا   تیری دُعاؤں سے ملا
تُو چاہتوں کا آستاں   تو برکتوں کی کہکشاں
تسکینِ دل، تنویرِ جاں   میری متاعِ دو جہاں

اے میری ماں!

گو میرے بالوں پر بھی تھی   پیری کی دُھوپ آئی ہوئی
سرپنچ مُکھیا گاؤں کا   میں چودھری چوپال کا

مَیں شاعرِ مشہور بھی   ہر شہر میں چرچا ہوا
کاٹے کئی جذبات میں   سو تیر محسوسات میں
افکار کا مارا ہوا   دن کا تھکا ہارا ہوا
آتا تھا تیرے پاس جب   اِک طفل بن جاتا تھا میں

اور مامتا کے لمس سے

تیری قبا کے سائے میں   تیری ردا کی چھاؤں میں

تیرے مقدس پاؤں میں

جو نیند آتی تھی مجھے

پھولوں کے بستر میں نہیں   ریشم کی چادر میں نہیں
پریوں کے گیتوں میں نہیں   دُنیا کی ریتوں میں نہیں
سر رکھ کے تیری گود میں   بے فکر سو جاتا تھا میں

معصوم بچّے کی طرح

جو کھیلتا ہو صحن میں   جو دوڑتا ہو کھیت میں
جو لوٹتا ہو ریت پر   ننّھے گھروندوں میں لئے

وُہ خواب جو دیکھے نہ تھے

وُہ چاند جو نکلے نہ تھے

احساس میں رَچتی ہوئی   خورشید کی پہلی کرن
اطراف میں اُڑتا ہوا   خوش تتلیوں کا جھرمٹ
لمحے سہانے رُوپ میں   جُوں دوپہر کو نہر پر
دھوئیں پرندے چونچ سے   اپنے پَروں کو دُھوپ میں

لیکن اچانک ایک دن

جب تیری آنکھیں مُند گئیں   جب تیری دھڑکن سو گئی
جب تو مری آواز پر   بولی نہیں، دھڑکی نہیں
کرنوں کا دریا رُک گیا   لمحوں کا پرچم جُھک گیا

اور ساتھ تیرے مرگیا

وُہ تیرا طفلِ شادماں

اے میری ماں! اے میری ماں!

چراغ حسن حسرت کی نذر

دل سے دل آرام کی باتیں کریں
مے سے رقصِ جام کی باتیں کریں

جس کو دیکھے اک زمانہ ہو گیا
آؤ اُس کے نام کی باتیں کریں

جس سے کچھ شاداب گزری زندگی
اُس خیالِ خام کی باتیں کریں

اُس گلی میں ٹھوکروں کا ذکر ہو
ریشمی آلام کی باتیں کریں

زندگی کی تلخیوں کے باوجود
مہرباں ایام کی باتیں کریں

○

نذرِ صادقین

زندگی کی روشنی کا رازداں ہے صادقین
آدمی کی دھڑکنوں کا ترجماں ہے صادقین

اُس کا ہر خط دلکشی کی ایک مثالی ادا
چاندنی کی اِک مسلسل کہکشاں ہے صادقین

ایک نقطے پر کبھی ٹھہری نہیں یہ موجِ رنگ
ہر نفس پراں و جولاں و جواں ہے صادقین

بولتی قوسوں کی محرابوں میں سیّاروں کے خواب
رتجگا رنگوں کا لفظوں کی زباں ہے صادقین

اُس کی مٹی سرخرو خوش بخت اُس کے بام و دَر
جن گھروں، جن آنگنوں کے درمیاں ہے صادقین

مسعود کے نام

چھا چلی ہے زیست کے پُر ہول ویرانے پہ رات
میری اُمیدوں کے تاروں کو ذرا آواز دو

میرا گردابوں سے، طوفانوں سے لڑنا دیکھ لیں
ناخداؤں کو ــــــ کناروں کو ذرا آواز دو

تلخیِ امروز کیا اب کھا ہی جائے گی مجھے
عمرِ رفتہ کی بہاروں کو ذرا آواز دو

میری زخمی روح کو ڈستی ہوئی تنہائیو!
میرے یاروں، غمگساروں کو ذرا آواز دو

اور بھی کچھ خشمگیں موجیں اِدھر، میری طرف
وقت کے سفاک دھاروں کو ذرا آواز دو

آج دل ہے اور سیلِ نغمہ و طوفانِ اشک
آج میرے رازداروں کو ذرا آواز دو

باوجودِ یورشِ غم مسکراتا ہے ضمیر
زندگی کے سوگواروں کو ذرا آواز دو

○

مجسم حُسن یکسر روشنی بن جائے گی دُنیا
مگر کیا جانیے اس موڑ تک کب آئے گی دُنیا

تمنا ترک کر ڈالی، توقع چھوڑ دی ہم نے
ہمیں اب اس سے بڑھ کر اور کیا سمجھائے گی دُنیا

لشکتی دھوپ میں رستوں کے پتھر توڑنے والو!
جہاں تک تُم اسے لے آؤ گے، آ جائے گی دُنیا

ہر اک ساعت سنہرے موتیوں کا تھال رکھتی تھی
بہت غم دیکھنے پر بھی بہت یاد آئے گی دُنیا

اصولوں کی چمک، خوابوں کے انجم، ذہن کے موتی
یہ اُس کا قرض ہے جب بھی طلب فرمائے گی دُنیا

ہمیں معلوم ہے دُنیا میں اِک دن ہم نہیں ہوں گے
مگر جو ہم پہ گزری ہے، اُسے دوہرائے گی دُنیا

○

پیش قدمی

(دوسری جنگِ عظیم کے دوران)

اِک اجنبی دیس کے ساحل پر
سہمے ہوئے دھندلے قصبے میں
ڈر کے سائے، دیواروں پر
بھوکی خلقت بازاروں میں
مدت سے دلوں میں دھوپ نہیں
جلتے جذبات، اُٹی نہریں

کچھ جسم بکاؤ منڈی کے
کچھ کال گھٹیلے مُردوں کا
کچھ خون میں گرمی ڈالر کی
کچھ جادو بانکی وردی کا
اے دُور وطن کے شہزادو!
یہ کیمپ کی رات غنیمت ہے
جی بھر کر پی لو آج کی شب
مے آنکھوں کی، رس ہونٹوں کا
جی بھر کر جی لو آج کی شب
دشمن کی گولی تاک میں ہے

○

کتنے صحرا اُڑتے دیکھے، وقت کی تیز ہواؤں میں
رفتہ رفتہ ہر ساحل بہہ جاتا ہے دریاؤں میں

مٹی رُخ پر، پیپڑی لب پر، چھالے ننگے پاؤں میں
چرواہا جب لے کر آیا اپنی بھیڑیں گاؤں میں

شب کو سر پہ ہوڑائے دیکھی صحن کی بیری بُور بغیر
جیسے کوئی راجکماری، گُم سُم سوگ سراؤں میں

خواب نگر کا سُکھ اُجیارا یارب کون سے دیس گیا
شہر میں پیتہ جام ہوا، سرسوں مرجھائی گاؤں میں

صدیاں کچھ ایسے لمحوں کی بھیک پہ زندہ رہتی ہیں
مائیں دوڑیں مقتل کو اور کانپیں ہاتھ دعاؤں میں

شالا پھر لوٹ آئیں وہ آغازِ سفر کی شُبھ گھڑیاں
جھُومر جن کے ماتھوں پر تھے جھانجر جن کے پاؤں میں

حرص سے جو خواہش اُگتی ہے، قحط سے پاتی ہے وہ رزق
مظلوموں کا خون ملے گا، سب اندھی آشاؤں میں

پھولوں کے تَن کانٹے اس کے، چاند برابر اس کی خاک
راوی، جہلم، سندھ، چناب کی رچنا جس کے ناؤں میں

موت کی منڈی

(تھامس ہارڈی کی ایک نظم کا عکس)

ہم دونوں نے
بازار کی ایک سرائے میں
اِک میز پہ کھانا کھایا تھا
کِس پیار سے کاک اُچھالے تھے
ہاتھوں میں ہاتھ بھی ڈالے تھے

پھر اِک دن دونوں شامل تھے
صف آرا دُشمن فوجوں میں
دو متحارب
آپس میں اُلجھتی — جھاگ اُڑاتی موجوں میں
بندوق اُٹھا لی تُو نے بھی
بندوق نکالی مَیں نے بھی
تڑ! تڑ! تڑ! تڑ!
تُو ڈھیر اُدھیر — مَیں ڈھیر اِدھیر
اندھیر اُدھر — اندھیر اِدھر
یُوں موت کی منڈی لگتی ہے

عبدالعزیز فطرت کی یاد میں

وہ فطرت وہ محبوبِ اربابِ فن
فروزاں تھا جس سے دلِ انجمن
وہ جانِ سخن - قدر دانِ سخن
وہ دلدارِ دلدادگانِ سخن
زباں جس کی جانِ زبانِ غزل
بیاں جس کا حسن بیانِ غزل
بہ اتمام - حُسنِ عجم شعر میں
غزل کے غزالوں کا رَم شعر میں
وہ جس کی غزل کا یہ انداز تھا
کہ دل کے دھڑکنے کی آواز تھا
ہوئی ختم یہ داستاں دوستو
کہاں اب وہ پیر مغاں دوستو

بیٹے احتشام کے نام

(پاکستان ملٹری اکادمی کاکول میں کامیاب ہونے پر)

اے مرے نورِ نظر، لختِ جگر جانِ پدر
میری شاخِ باثمر، میری دعائے بارور
تُو مرے گھر کا اُجالا، تُو مرے رستے کا نور
تُو مری تہذیب کا ورثہ، تمدن کا شعور
ہم نے بچپن میں تجھے پالا وطن کے نام پر
بارک اللہ آج دے ڈالا وطن کے نام پر
پاک لشکر کا جواں بننا مبارک ہو تجھے
اپنا پرچم تھام کر چلنا مبارک ہو تجھے
زندگی کا اس سے بڑھ کر بانکپن کوئی نہیں
تیری "وردی" سا مقدس پیرہن کوئی نہیں

آوازیں

(اپنی کمسن بچی تابندہ ضمیر کی قبر پر)

مَیں "موتی" کھاؤں — مَیں "کھالہ" جاؤں
مَیں "ساما" کھیلے — مَیں "چُوچُو" لے لے
میں "پی پی" جانا — مَیں "جیدی" جانا
"آمی" جی! — "آبا" جی!
باپ کی موتی تاری بچی — ماں کی پھول پیاری بچی
تابندہ میری پیاری بچی
دیکھ تیری اُمّی اور ابا — تیری تُربت چُوم رہے ہیں
یادوں کی ننھی ڈھیری کے — آگے پیچھے گھوم رہے ہیں
ہم سے بول، ہماری بچی
"امی" جی! — "آبا" جی!

طائفۂ دل فروشاں خیلِ مے خواراں کے ساتھ
نیند کی وادی میں رہیئے شہرِ بیداراں کے ساتھ

جانے کس صحرا سے پاگل ہو کے آئی ہے ہوا
گرد بادوں کا سماں ہے موسمِ باراں کے ساتھ

مستقل محرومیوں کے بند کوچے، تنگ صحن!
زندگی تھی ایک لمبی رات بیماراں کے ساتھ

میں تو جو بھی لفظ لکھتا ہوں وہ کہتا ہے مجھے
دیکھ سمجھوتہ نہ کرنا بیشں آزاراں کے ساتھ

شیخ عفوِ حق کی جو تفسیر کرتا ہے کبھے
ایک بدلی سر پہ چلتی ہے گنہگاراں کے ساتھ

بادلوں کو پورب اور پچھم سے چُن لائے تھے ہم
جل گئے سب کھیت۔ لیکن موسمِ باراں کے ساتھ

○

وہی دیوار کی حسرت وہی در کی صورت
لوگ جاگے تو بدل جائے گی گھر کی صورت

کوئی چشمہ نہ سرائے نہ شجر کی صورت
رہ گزر یہ ہے تو پھر کیا ہو سفر کی صورت

یہ بلائیں جو ہیں اطراف میں ٹلنے کی نہیں
کوئی تاوان ادا کیجیے سر کی صورت

حُسن ہر روپ میں کافر ہے یہ مانا، لیکن
اِک قیامت ہے جوانی میں بشر کی صورت

تیرے گیسو ہیں جوانی کی ڈھلتی شب کی طرح
تیرے رخسار کی رونق ہے سحر کی صورت

ایک اُلجھن سے رہائی نہیں پائی تھی ضمیر
نکل آئی کسی آزارِ دگر کی صورت

○

معافی نامہ

(۱)

یہ معافی نامہ ___ یہ پروانہ ___!
یہ خونناب نذرانہ ___ میرا
یہ سلام !
اُس کے نام !

میری ہنستِ غم ___ مری ہم شجرہ و ہم آستاں
ہم داستاں !
عہدِ طفلی میں ہمیں باندھا گیا
زندگی کے رشتۂ پُر پیچ میں
ایک دیرینہ، مسلسل، رنگین، روتی روایت کے لئے جونچیں تیز کرتے، لڑتے بھڑتے اُڑ گئے
اک معزز خانوادے کی ضرورت کے لئے
جشنِ غارت کے لئے
جس قبیلے نے درو دیوار میں پالا گیا
اُس کے اندر قید کر ڈالا گیا

بے خبر دونوں ابھی تک زیست کے مفہوم سے
سوز و سازِ جستجو سے
درد و داغِ آرزو سے
جبرِ جاں ___ عہدِ وفا سے بے خبر !
اپنے خوں میں رنگ کی بجتی صدا سے بے خبر !
آنکھ میں کوئی اشارت ہی نہ تھی
ہونٹ پہ دل کی عبارت ہی نہ تھی
دھڑکنوں کی تال پانے کی مہارت ہی نہ تھی

جسم کی بھُوک کی حرارت تو کُجا
بچپنے کی نیند میں کوئی بُجھارت ہی نہ تھی

راستے اپنے رہٹ کے کھیت تک محدود تھے
سب گھروندے ___
اپنی گلیوں کی پڑوسی ریت تک محدود تھے

میل تھا گویا بچھڑنے کے لئے
پھُول کا کھِلنا بکھرنے کے لئے
جھیل پر دو ناسمجھ بگلوں کا جوڑا جس طرح
چند ساعت پانیوں میں تیر کر
اپنا جوگا جگ کے ___ پَر پھیلائے ___
کیا خبر تھی
اپنی پوری زندگی کا موڑ دونوں مُڑ گئے
پھر نہ مِلنے کے لئے
پھر نہ کھِلنے کے لئے

مَیں تو اپنے لااُبالی پن میں پھر بھی جی گیا
دیس کے پردیس کے
بستیوں، شہروں، جزیروں، ساحلوں پر بھی گیا
کتنے چہروں، کتنی آنکھوں کی شسندرتائی گیا
اور پھر ___ کتنی دل آرا رونقیں اور لذتیں
جاں فزا فرحا کے نظاروں میں لے آئیں مجھے
پیار کی تازہ رُتیں پیاروں میں لے آئیں مجھے
اپنے گھر کی نرم دیواروں میں لے آئیں مجھے

وہ مگر
ایک نام
ایک شام
اپنے سینے میں سے بیٹھی رہی
اک مسلسل موت، جینے میں سے بیٹھی رہی
(۹، نومبر ۱۹۸۶ء)

(۲)

یہ معافی نامہ، یہ پروانہ ___
یہ خونناب نذرانہ میرا
یہ سلام !
اُس کے نام !

دُور یورپ کے جزیروں کا وُہ خوابِ دلنشیں
جنگِ عالمگیر کی وُہ باش گاہِ عسکری
وہ مرے الھڑپنے کے روز و شب
میری کپتانی کی وردی کی وُہ نَو آموز چھب
وُہ کہ تھی
باجرہ و سارنگ کے رنگوں کا سحرِ دلبری
دستِ کمپونگوں کی کافر سادگی
وُہ سراوک اور سبا کی دلکشی
ناریل کے شاخساروں سے ___
اُترتی، گنگناتی ___
جاگتی سوتی ___ وُہ پیاری، وُہ کنواری چاندنی

ایک ناشہری ___ کھری کمپونگ زادی، بے خبر
وُہ جہاں ناآشنا ___ میری زباں ناآشنا
ہائے اُن آنکھوں کی صہبا، ہائے اُن ہونٹوں کا رس

وُہ گلابی —— دہکے دہکے خد و خال
وُہ سڈول اندام —— مے آبادِ چشم و سرو قد
حُسنِ نسوانی پہ جاوا اور ملایا کی سند

جس کے چہرے نے ابھی
ناچتے بنکاک و سنگاپور کے
شب گھروں گاتے طرب گیتاؤں "جسم اوپراؤں" کا
زخمِ ہوس کھایا نہ تھا
اس فرنگی فاتحوں کی رات نے
گاؤں کے اس شبنمیں سُورج کو گہنایا نہ تھا
اجنبی رستوں میں میری ہم طریق
میری شب بسری کے خیمے کی رفیق
میری دلبر تھی، میری دلدادہ تھی
اپنی شوخی —— دو بُری چادر کی صُورت سادہ تھی
میری خاطر —— زندگی کی ڈور میں لپٹی ہوئی
اُن سنہرے ٹاپوؤں سے
ہند کو ہجرت پہ بھی آمادہ تھی
وُہ کہ تھی
ایک مستی، اِک خیال
میرے صحرا، میرے ٹیلے اُس کے سحر و خیال
اُس کو کیا معلوم —— مَیں راہی سپاہی
جسم جُو —— آوارہ خُو —— مَیں بے وفا
اُس کے دریاؤں سے دُور
ایک ساحل آشنا
تاجِ انگلستان کی مجبور نو آبادیوں کا لشکری
ایک دن!

ناگہاں!
سانپ رستوں سے، سرکتا، رینگتا
آخری بوسے کی حُرمت کے بغیر
اپنے لَب کھولے بغیر
اُس کا غم تولے بغیر
لفظ جو اس کی امانت تھے کبھی بولے بغیر
آخری آنسو کا موتی اپنی آنکھوں میں لئے
زندگی بھر کی چتائیں اُس کی راتوں کو دیئے
چھوڑ جاؤں گا اُسے،
اُس کو کیا معلوم تھا
اُس کے کمپونگوں کے پاس
دیو پیکر اک جہاز
پھُونکتا ہے سیٹیاں — لنگر اُٹھانے کے لئے
میری "پلٹن" کوچ کر جانے کو ہے
یہ مسافر اپنے گھر جانے کو ہے
اُس کو کیا معلوم تھا
اجنبی لشکر نہیں رُکتے چلا جاؤں گا مَیں
چھوڑ جاؤں گا اُسے جس وقت وہ
ٹانکتی تھی میری وردی کے تراشیدہ بٹن
اپنے شانوں میں نئے بیلے کی بیلوں کے تلے
بے خبر!

فروری ۱۹۴۸ء

(۳)

اُس کے نام!
جو گزشتہ چہل و سہ برسوں سے ہے میری رفیق
فاقہ مستی سے پریشاں پھر بھی فاقوں میں شریک
روز و شب کے ان ہلکوں، ان ہجروں میں

ہم دم و ہم امتحاں
مشترک خوشیوں کی، سانجھی حسرتوں کی رازداں
ہم قدم، ہم داستاں
میرے سناٹوں کا ساگر، میرے نغموں کی زباں

جس کی ذات
درد و درمانِ حیات
جس سے میری رات روشن وُہ چراغانِ حیات
میری خوشبُو —— میری بات
میرے خوابوں کی امیں، میرے خرابوں کی اماں
آرزُو کے مقتلوں میں، خواہشوں کی قبر پہ
ایک آنسو، اک ستارہ، اک دیا، اک داستاں
میرے دو بیٹوں کی ماں
میری نہدہ —— میری کماں

اپنی اس چھوٹی سی دُنیا میں مگن
اپنے صدیوں میں رچے سادہ تمدن کی طرح
تانبے کے کٹوروں، دیگچوں، مُرغی کے چوزوں، مرتبانوں اور
گھڑے گھڑونچیوں کی پاسباں
بے نیازِ کاہشِ سود و زیاں
میری جاں! —میری جہاں! —

میری بیمار اور بوڑھی — خاصی جابر — ماں کی —
خدمت گار بھی
بھائیوں —— میرے چچازادوں ——
قبیلے کے بزرگوں کی قدم بردار بھی
گاؤں کے بے بستر و بے وقت مہمانوں کی۔

پُرسش کار بھی

اور وُہ میرے لئے
زندگانی کی کڑکتی دُھوپ میں
صحن کی چھتنار بیری — سایۂ دیوار بھی
ابرِ گوہر بار بھی
میری شاخِ آشیاں — میری تھکن کا آستاں
میری جاں — میری جہاں!

میری درویشی کی ساتھن — ساتوری
باوری
اُس نے اک لمبے خلا میں
بے گھری — بے چارگی کی زندگی
(میری بے ترتیبی و آوارگی کی زندگی)
وُہ قیامت
کس قناعت، کس وجاہت سے "جری"
"پرس" خالی — آنکھ اشکوں سے بھری
مالکن گھر کے بغیر
تار — زیور کے بغیر
لاج — چادر کے بغیر
ریشم و کمخواب میں لپٹی ہوئی ہمسائیاں
اور یہاں۔
مدّتوں گھر میں نہ چھنکیں جھانجھریں
مدّتوں گھر میں نہ بولیں چوڑیاں
(اک مسلسل غم کا ساون — آنسوؤں کے درمیاں)
وُہ مگر
خواہشوں کی قتل گاہوں میں بھی ہنستی ہی رہی
اپنے ویرانے میں بستی ہی رہی

مَیں کہ تھا
اک صدا اُڑتا پرندہ رہنِ بزمِ دوستاں
لمبی لمبی، کھوئی کھوئی —
تشنۂ عرفانیوں — رومانیوں، سیلانیوں کی
ابرو بادآلودہ شبہائے سیہ مست و جواں
ایک دُنیا سے شناسائی مری
گھر میں سناٹا مگر باہر پذیرائی مری
مجلس آرائے ہُنر
(میری بچوں کی خبر سے بے خبر)
بزمِ عرضِ شعر میں گزرے تھی رات
شاخِ آہو پر برات
زندگی میں "فیل" — لب پر فاعلاتُ — فاعلات!
دو بجے شب کو بھی گھر آیا تو پایا
اُس کو دروازے کے پاس
زرد، سرد و بے حواس
رہنِ یاس
منتظر!
اور پھر
گھرکیاں بھی دیں مگر روٹی بھی دی
خود وُہ ٹھنڈی تھی مگر روٹی ہمیشہ گرم تھی
میرا غم کھاتی رہی، اپنا لہو پیتی رہی
میں نہ مر جاؤں کہیں اس خوف سے جیتی رہی
اور طالع یاورش بخیر
نوجوانی کی جہاں گرداں رُتوں
خوش فرصتوں، کم تجربوں، دَر در شلوں
کے دور میں

میری وہ معصوم — وُہ نادار و بے آزار سی۔
بے خواریوں
شب گردیوں پر سرگراں
بپھری ہوئی اک شیرنی آتش بجاں
حافظ و غالب وغیرہ سے تو واقف ہی نہ تھی
جن سے واقف تھی بھی
اُن میرے معاصر نابغوں میں بعض کی
فاسقانہ عادتوں اور عاشقانہ شہرتوں —
سے بدگماں
میری خوش نظری کی بشری لغزشوں پر عمر بھر
جنگ میں زخمی سپاہی کی طرح —
خونخوار بھی

عمر بھر
مومنانہ برہمی بھی — کافرانہ پیار بھی
آس بھی — آزار بھی
پھول بھی — تلوار بھی
دوستِ روحانیاں وُہ دشمنِ رامش گراں
مہرباں — نامہرباں
میری جاں — میری جہاں —
وُہ کہ بس میری محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
جُز وفا کچھ بھی نہیں
سوز جو میری غزل میں درد جو گیتوں میں ہے
پوچھتی رہتی ہے اک گہری مگر معصوم سی تشویش ہے
یہ بتا یہ راگنی کس نار کی پیتوں میں ہے

گرچہ میرے کربِ شعری سے شکایت بھی رہی
اپنی اس نادیدہ سوکن سے بغاوت بھی رہی
بارہا گھر میں "ایمرجینسی" کی حالت بھی رہی
لیکن اُس کو میرے نغموں سے محبت بھی رہی
اپنی باتوں میں مری آسان شعریں بولنا
میری تحریروں کی ٹوٹی ٹوکری کو جھاڑنا
اور ـــــ کھولنا
اور میرے بچپنے کی کاپیوں کو چوری چوری پھولنا
اس طرح اپنے خوابوں کی عبادت اُس نے کی
گھر میں ہر کاغذ کے پُرزے کی حفاظت اُس نے کی
بیچ دریا کے ہے دریا پار بھی کرتی نہیں
پیار کرتی ہے مگر اظہار بھی کرتی نہیں
اس طرح جلتی رہی ـــــ ہاں اس طرح جلتی رہی
جس طرح نادار کے چولھے میں گیلی لکڑیاں

میری جاں! ـــــ میری جہاں!
دیکھتا ہوں روز و شب
اک کھجوروں کی چٹائی پر دُعا کرتے ہوئے
آنسوؤں سے بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے
دُکھ میں بھی سُکھ کی طرح شکرِ خدا کرتے ہوئے

ہاتھ اُس کا تھا کہ جس کو تھام کر چلتا رہا
اُس کے چہرے سے مرے گھر کا دیا جلتا رہا
میرے جنگل کے سفر میں میری بستی کا دُھواں
میری جاں! ـــــ میری جہاں!

(۱۲؍ دسمبر ۱۹۸۶ء)

نوحہ

(ایک خود غرض سیاستدان کی موت پر)

گھر کے دالان میں لاش رکھی ہوئی ہے
لاش لپٹی ہوئی ہے
بڑی قیمتی، ریشمی چادروں میں
اچانک ہی کل
ایک کیلے کے چھلکے سے پھسلا
گرا اور گر کر نہ اُٹھا
زن و مرد کا اک ہجومِ فراواں
کھڑا ہے سرہانے
مگر اس ہجومِ فراواں میں بس ایک میں ہوں فسردہ
فقط ایک میں رو رہا ہوں
کہ یہ شخص پھانسی کے پھندے سے کیوں بچ گیا ہے

ضمیر کا گھر

[مجھے کچھ عرصہ ایک خستہ حال سے چوبی مکان (HUT) کے نصف حصّے میں رہنے کا اتفاق ہُوا ۔ مالک مکان نے ہٹ کے دو حصّوں کو الگ الگ کرایہ داروں میں کچھ اس طرح تقسیم کیا تھا کہ آدمی خواہ کسی حصّے میں رہے ضرورت کی اکثر چیزیں دوسرے حصّے میں رہ جاتی تھیں ۔ (ضن)]

لکڑی کی 'نصف ہٹ' میں بسیرا ہے آج کل
فدوی بشر نہیں ہے 'بٹیرا' ہے آج کل
دو 'کمریاں' کہ عرض ہے جن میں نہ طول ہے
جینا اگر یہی ہے تو مرنا فضول ہے

جو چیز جس جگہ تھی ضروری، وہیں نہیں
چھت بے تکلفی میں کہیں ہے کہیں نہیں
آواز جو بلند ہوئی پار ہو گئی
اب گھر میں بات چیت بھی دشوار ہو گئی

پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے چھت بھی چلی ہوئی
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی
دیوار اِس طرف ہے تو شہتیر اُس طرف
جلسہ اِدھر ہے نعرۂ تکبیر اُس طرف

اسٹور اِس طرف تو 'کچن' دوسری طرف
'ٹب' اِس طرف تنگے ہیں 'ٹمن' دوسری طرف
شاعر اِدھر ہے، مشقِ سخن دوسری طرف
زن اِس طرف بپا ہے 'بزن' دوسری طرف

صحنِ چمن کی نہر بہ لیلن دوسری طرف
نلکے کا دھڑ اِدھر ہے تو 'تھن' دوسری طرف
بیلیں اُگی ہوئی ہیں ترے در کے سامنے
کدو اُچھل رہے ہیں مرے گھر کے سامنے

مرغوں کا شوق ہے جو اُدھر کے مکین کو
اچھی سزا ملی ہے اِدھر کی زمین کو

بیوی کی قبر پر

میری بیوی
قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے
اور میں بھی ہوں آرام سے

"مُسدسِ بدحالی"

سیاست کا ہر پہلواں لڑ رہا ہے
یہاں لڑ رہا ہے، وہاں لڑ رہا ہے
بیاں کے مقابل بیاں لڑ رہا ہے
"حسابِ دلِ دوستاں" لڑ رہا ہے
ستارہ نظر مہ جبیں لڑ رہے ہیں
یہ حد ہے کہ پردہ نشیں لڑ رہے ہیں

مزاجوں میں یوں "لیڈری" آگئی ہے
کہ گھر گھر کی اپنی الگ "پارٹی" ہے
کوئی "شیر" ہے تو کوئی "لومڑی" ہے
یہی اپنی لے دے کے "انڈسٹری" ہے
نہ منزل نہ جادہ نہ کوئی ارادہ
رضا کار کمیاب، لیڈر زیادہ

کل شب جہاں میں تھا

[ہمارے محکمے کے ایک اعلیٰ افسر کو قوالی سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ایک مرتبہ ایسے اناڑی قوالوں کو پکڑ لائے جو کچے راگ میں کچے تان پلٹے لگانے اور الفاظ کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کے ماہر تھے۔ ماتحت عملے کی چار راتیں اسی شور و غوغا کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ (ض)]

پے بہ پے قوالیوں کی پالیاں ہونے لگیں
دن نکمے اور راتیں کالیاں ہونے لگیں
رفتہ رفتہ تالیاں بے تالیاں ہونے لگیں
ہوتے ہوتے مشتعل گھر والیاں ہونے لگیں

اک میاں اُچھلا تو بیوی نے کہا اے جانِ من!
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!"

...گھی کے ساتھ

گو زندگی کے ساتھ ہیں شرمندگی کے ساتھ
کوٹھی ہے ساتھ کار کے، روٹی ہے گھی کے ساتھ

یہ حادثہ عجیب ہوا آدمی کے ساتھ
تاریک ہو گئی ہے نظر روشنی کے ساتھ

دونوں کو ان کے ظرفِ مروت کی داد دو
راشدؔ کے گھر میں شامِ غزل جعفری کے ساتھ

ہم سے بھی چھوڑ دیں گے مگر آپ شیخ جی!
کچھ روز جا کے رہیے کسی آدمی کے ساتھ

حافظؔ کی لے میں شعر تو ممکن نہیں ضمیرؔ
طبلہ بجا رہے ہیں ذرا فارسی کے ساتھ

تھا فیصلہ غلط کہ نہایت غلط، مگر
بندے علی نے ووٹ دیا پارٹی کے ساتھ

تیل میں آگ

کویت پر عراق کے حملے سے خلیج کے خطے کے بحران پر بالخصوص سعودی عرب کے دفاع کے لیے امریکی و افرنگی فوجوں کی لگی صف آرائی کے ضمن میں

جو تھی مخصوص ڈالروں سے کبھی
اب "ریالوں" کو لاگ لگ گئی ہے
دیکھیے اس میں کون کون جلے
تیل کے "منٹ" میں آگ لگ گئی ہے

اندازِ دلبری

جس کو عورت کرے پسند
اُس کُن رکھے اکھیاں بند
کپڑے کتنے بھی ہوں تنگ
جکڑا، بکڑا، اِک اِک انگ
جتنی تنگ اُتنی خوب پسند
کس کر باندھے چاروں بند
بے شک دو گز اور چند
تنگ لبادہ بڑا پسند

ضمیریات

(پنجابی)

ہر ساہ ہے کہ بیان گھٹی جا رہیا ہاں مَیں
سجے ہوئیاں تُوں ہوڑی سِجا رہیا ہاں مَیں
کڈ دا نہا ڈے سامنے ٹُریا رہیا ہاں مَیں
دستو خاں آ رہیا آں ہیں یا جا رہیا ہاں مَیں
اِس طرحاں وی لبا ہے محبت دے لازمے
اوہ جھوٹ بولدی اے، قسم کھا رہیا ہاں میں
کی آپ تُوں بتاواں اُدھاری خوشی دی ہُوک
ہسنے تے گُھٹ رہیا سی جے شرما رہیا ہاں میں

ضمیر سڑک

شکریہ جہلم کی ضلعی کونسل کا شکریہ!
رکھ دیا ہے اک سڑک کا نام میرے نام پر

جن سڑکوں گاہوں میں کھیلا ہے مرا بچپن ضمیر
اس مسافت کی رفاقت دور تک کھتا ہوں میں

یُوں لیا آخر مری خانہ بدوشی نے خراج
گھر تو میں رکھتا نہیں لیکن سڑک رکھتا ہوں میں

چک عبدالخالق (ضلع جہلم) ——— ۲۰ جنوری ۱۹۸۷

رابطے کا ضابطہ

تنگ کا نُساتی ہے، میں شش جاتی ہے
عاشقی کا مقصد اب دال اور چپاتی ہے
دوستی ضرورت کی کم معاشیاتی ہے
پیار حادثاتی ہے، ربط واجباتی ہے

کھانستا تو رنگین ہے چھینک ہم کو آتی ہے

منی پیگ، کینیڈا ——— ۱۹۸۶ء
(معروف شاعرہ عرفانہ عزیز کے گھر)

صدر امریکا

ضمیریات

سید ضمیر جعفری

انتخابات جداگانہ میں کافی ہے یہ بات
زندگی کا اک الگ انداز و پیمانہ ہیں ہم
"خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی"
"تن" کی دنیا پر نہ جا، من کے جداگانہ ہیں ہم

ضمیریات

سید ضمیر جعفری

مختلف نادانیاں، اور مختلف دانائیاں
مختلف اوقات میں انسان کو خوش آئیاں
جن کے کارن ہم نے جھیلیں اس قدر رسوائیاں
کچھ "پرانے جھوٹ" تھے اور کچھ "نئی سچائیاں"

ضمیریات

سید ضمیر جعفری

استقامت اپنا شیوہ زندگی کے کھیل میں
ٹوٹ جائیں جنگ میں جو اپنی تلواریں نہیں
ہم شہاب الدین غوری کے روایت کے امیں
جیت میں پاگل نہ ہوں اور ہار میں ہارے نہیں

کرکٹ کے کوارٹر فائنل میں بھارتی ٹیم سے شکست پر

ضمیریات

سید ضمیر جعفری

آپ کی ماڑی اونچی پلنگ نواری جی
آپ کے ہاتھ میں طاقت والی آری جی
آپ ہی کیجئے ملک کی کارپراری جی
صدر پاکستان جناب لغاری جی

امریکی یلغار

جان نکسن آ گئے یا جارج میگھی آ گئے
جیسے آئے تھے کبھی انگریز یہ بھی آ گئے

ڈالر اور کالر

ہم 'سٹرلنگ' سے نہ چھوٹے تھے کہ 'ڈالر' آ گیا
اپنی گردن ناپنے کو اور 'کالر' آ گیا

سفرنامہ — بحرِ اوقیانوس کے اُس پار — قسط : ۲۸

سید ضمیر جعفری

نیویارک کی گشت

آج شفیق اور تنویر نے نیویارک دکھانے کی طرح دکھایا۔ اگلی سڑکوں سے ہوتے ہوئے پچھلی گلیوں تک۔ اصلی بھی۔ نقلی بھی۔ شہر کے ایسے ایسے پردے اٹھائے جو کوئی نامحرم نہ اٹھا سکتا۔

صبح تو شفیق کے ایک دوست (گجرات کے) جاوید قریشی اپنی موٹر میں ہم دونوں کو "مین ہٹن" کے "فرسٹ ایونیو" پر مجلس اقوام متحدہ کی بلند و بالا عمارت کے سامنے اتار گئے۔ عمارت کے سامنے دنیا کے تمام ممالک کے پرچم لہرا رہے تھے۔ پاکستان کا ہلال و ستارے والا سبز و سفید جھنڈا اپنی شان کے ساتھ قطار کے تقریباً وسط میں سربلند نظر آیا۔ کشمیری مسلمانوں کا ایک گروہ اور "خالصتانی سکھوں" کا ایک جتھا اپنے اپنے مظاہرے کر رہے تھے۔

سکھ جتھا کبھی کبھی اپنا نعرہ ----- کرے گا راج خالصہ ہو رہ نہ کرے کو ------ چھوڑ کر کشمیر کی خود ارادیت کے نعرے لگانے لگ جاتا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق تنویر قاسم بھی ہم سے وہیں آملے۔ ان کی گاڑی وہیں "پارک" کر کے اور مجلس اقوام متحدہ کے مندوبین کے "دور درشن" سے فارغ ہو کر ہم تینوں نیویارک کی گلیوں میں پیدل ڈوبتے ابھرتے ریلوے اسٹیشن تک چلے گئے جو شہر کی قدیم ترین عمارت کے زیریں حصے میں واقع ہے۔ مجرموں اور بلیک منگوں اور نشہ باز ملنگوں کا "گڑھ" بھی اسی علاقے میں ہے ریل گاڑیوں کو کئی جگہوں پر اس طرح نکلتے دیکھا۔

جیسے وہ لوگوں کے گھروں میں سے نکل رہی ہوں۔ ایسے ایسے مناظر بھی سر راہ دیکھنے میں آئے کہ ہمارا بڑھاپا ہم سے دس سال آگے نکل گیا۔ کتابوں کے خوبصورت اسٹال جابجا بکھرے دیکھے۔ معلوم ہوا کہ کتابوں کے اسٹالوں کے ایک وسیع سلسلے پر ایک ان پڑھ بھارتی سیٹھ کا قبضہ ہے۔ مرکزی لائبریری دیکھی۔ دیکھنے کے لیے تو دو چار دن درکار تھے۔ یہ کہیے کہ "سونگھ" لی۔ کتاب کے سامنے جا کر آدمی بہت چھوٹا ہو جاتا ہے۔ لائبریری کے اندر داخل ہوتے ہی امریکہ کی عظمت کا احساس سیاح کو مکمل اپنی گرفت میں لے جاتا ہے۔ اس نواح میں ہزاروں کبوتر بھی اترتے اڑتے دیکھے۔ شہرہ آفاق "ٹائمز چوک" میں انسانوں کا ایک میلہ بھرا ہوا تھا۔ یہاں ہیروئن کی خرید و فروخت کا دھندا بھی سربازار ہوتے دیکھا۔ ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پولیس کی آنکھیں بند تھی۔ دوپہر کا کھانا مرکزی بس کے اڈے کے ایک ریستوران میں کھایا۔ یہاں بھی ایک دنیا آباد پائی۔ یہیں سے زمین دوز ٹرین پکڑ کے پتہ نہیں کہاں جا اترے۔ جہاں سے اترے وہاں سے نیا "روٹ مارچ" شروع ہوا۔

جو تنویر قاسم کی موٹر پر جا کر ختم ہوا۔ اب شام کے ڈھلتے سائیوں میں ہماری سواری موٹر میں نکلی۔ بازاروں میں کرسمس کی آرائش کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہر کہیں بے فکروں کے ٹھٹ لگ رہے تھے۔ "راک فیلر اسکوائر" کی رونق بطور خاص دیدنی تھی۔ ملک ملک کے چہروں کی "کہکشائیں" زمین پر خراماں تھیں۔ "پاگل پن" کے دورے بارہ بجے شب کے بعد پڑنے والے تھے مگر

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد ان کو آ سکے

ساحل پر وہ بحری جہاز بھی دیکھا جو 1911ء میں جرمنی کی خرادوں میں ڈھلوایا گیا تھا۔ اس بحری جہاز نے 1914ء کی جنگ میں بحری معرکے بھی دیکھے تھے۔ اب اس بوڑھے جہاز میں ایک عجائب گھر قائم کر دیا گیا ہے مرا ہاتھی سوا لاکھ کا۔ روزانہ پچاس ہزار سیاح دیکھنے آتے ہیں۔ "مین ہٹن" کے ایک گرجے میں بھی جھانک آئے جہاں آٹھوں پہر چندے پر وعظ جاری رہتا ہے۔ گشت کرتے کرتے حمیرا کے ہاں جا نکلے جہاں محشر سرشار، جمیلہ بانو، جمشید، ترغیب اور نسیم کھانے کے میز پر بیٹھے تھے اور حمیرا توے پر سے گرم گرم پھلکے اتارے چلی جا رہی تھیں۔ مشاعرے کا لنگر قدرے دھیما پڑ گیا تھا مگر ہنوز تھما نہیں تھا۔ جمیلہ بانو انگریز کے نشان زدہ باقی اور اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیب و دانشور سجاد ظہیر مرحوم کی ہمشیرہ ہیں۔ ان کا ایک بیٹا ٹرانٹو میں ہوتا ہے۔ ہم بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ کھانے کے بعد ادبی بحث میں بھی شامل رہے جو گیارہ بجے جا کر جوبن پر آئی۔ (9 دسمبر)

واپس ڈینور میں

ایک ماہ کے بعد واپس ڈینور پہنچ گئے۔ الحمدللہ۔ شام کے پانچ بجے نیویارک کے "لگاروا" سے اڑے اور دس بجے مسلسل پرواز کرتے ہوئے --- ڈینور آن اترے۔ شفیق اور تنویر راہداری تک ساتھ آئے۔ ادھر آگے سارا مہر ہوائی اڈے پر موجود تھا۔ سبھی اداس تھے۔ سب سے زیادہ اداس ماؤ ضیا رتھا۔ آج تو یہاں موسم ٹھیک ہی معلوم ہوا۔ یوں شہر گھٹنے گھٹنے برف میں ڈوبا ہوا ہے نیویارک سے یہاں آکر ایک کھلے پن کا احساس ہوا۔ جیسے آدمی راولپنڈی شہر کی "گنج منڈی" سے نکل کر اسلام آباد کے "دامن کوہ" میں آجائے۔ سادگی کا احساس بھی ہوا۔ ایک خوشگوار ہوا --- جو فطرت کی گود ہی میں ہلکورے لیتی ہے۔

ہوائی جہاز---یو ایس ایئر" کا تھا۔ ہوائی سفر کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ احساس کچھ عجیب معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز میں ریل گاڑی کی طرح اوپر کی نشست نہیں ہوتی کہ مسافر کو سونے کے لئے اٹھنا پڑے اور اٹھنے کے لئے نیچے اترنا پڑے۔

ٹیلی ویژن پر "نوجوان نسل" کا پروگرام چل رہا تھا۔ ایک بات نے چونکا دیا۔ ایک حسین لڑکے نے ایک ماہ وش لڑکی سے پوچھا۔

"تم اپنے محبوب سے پہلی بات کیا کرنا چاہو گی" جواب تھا

رکھی تھی۔ پہلے ہی صفحے پر ۱۸۶۴ء میں۔ "کولڈ ہاربر"---پر "جنرل گرانٹ" اور جنرل "لی" کے معرکے کی روداد تھی۔ تیس منٹوں میں سات سو سپاہی---- انسان---جن میں سے کسی کی عمر تیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ مارے گئے۔ مردہ سپاہیوں نے اپنے سینوں پر اپنے وارثوں اور گھروں کے نام پتے لکھ رکھے تھے تاکہ ان کو ان کی ہلاکت کی خبر دی جا سکے۔ کتاب میں سپاہیوں کی ڈائریوں کے اقتباسات بھی نقل کئے گئے تھے۔ ایک جان ہار نے لکھا تھا۔

محشر بدایونی کے ہمراہ

"میں پوچھوں گی۔ جیک تمہیں کھانوں میں کونسی چیز مرغوب ہے۔"

حیرت ہوئی کہ اس سمندر میں ابھی تک ایسی ایسی مچھلیاں بھی موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں اس "گریباں چاک لڑکی" سے ایسے گھریلو سے جواب کی توقع نہ تھی۔

سفر میں ایک اور بھی قابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ ہمارے پہلو میں ایک ڈھلتی عمر کا گورا بیٹھا تھا۔ کھویا کھویا سا شخص۔ ہوائی جہاز کے بلند ہوتے ہی اس نے "بریف کیس" میں سے اپنا "مشینی شطرنج" نکال کر اس کی بساط اپنی گود میں جمائی اور "بازی" پر جھک گیا۔ مقابلہ اس کا اپنے ساتھ ہی تھا کہ دونوں طرف سے خود ہی کھیل رہا تھا۔ خود کوزہ و خود گل کوزہ۔ ہم نے امریکہ کی خانہ جنگی سے متعلق ایک کتاب کھول

"کولڈ ہاربر---پیاری ماں تیرا بیٹا آج ہلاک ہو گیا۔"

ہم سے مزید نہ پڑھا گیا۔ گھبرا کر پڑوسی کی شطرنج کی بازی پر نگاہیں جما دیں۔ ادھر بھی کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ مہرے سفید اور سیاہ رنگ کے تھے۔ "قتل عام"---"کالے مہروں" کا ہو رہا تھا۔ ہم ضبط نہ کر سکے۔ پوچھ لیا۔

"مسٹر! یہ پوچھنے کی معافی چاہتا ہوں کہ دراصل آپ کا "دل" کس طرف کھیل رہا ہے"

نوجوان نے منافقت سے کام نہ لیا۔ ہنس کر بولا:

"سفید مہروں کی طرف----روشنی کی طرف"

ہمیں اس کھیل میں مہارت تو قطعاً حاصل نہ تھی۔ ہاں رغبت ضرور رہی۔

مگر یہاں تو "رنگ اور نسل" کی حمیت کا مسئلہ تھا۔ "چیلنج" پھینک دیا۔

"اگر ناگوار نہ ہو تو "کالوں" کی "کمان" میں سنبھال لوں۔"

گورا کشادہ حوصلہ بھی نکلا۔ بولا۔۔۔۔ "اس سے بہتر اور کیا ہوگا۔"

مقابلے میں اترنے سے پہلے ہم نے دل میں دعا بھی مانگی۔۔۔۔ یا باری تعالیٰ ہمارے کھیل پر نہ جانا' ہماری نیت پر نگاہ رکھنا۔ ہمیں اگر اس بازی میں مات ہو گئی تو۔۔۔ طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں۔"۔۔۔۔ جنگ کا پانسہ پہلے ہی ہمارے خلاف پلٹ چکا تھا۔ ہمارے دونوں گھوڑے میدان میں کھیت پڑے تھے۔ گویا ہماری طرف سے دشمن کے "ٹینکوں" کے خلاف "انفنٹری" سینہ سپر تھی۔ ہمیں جیتنا تو کیا تھا' کامیابی کی انتہا اس کو سمجھا کہ بازی کو پھنسائے رکھیں۔ جس طرح امریکہ نے روس کو افغانستان میں پھنسائے رکھا۔ حربہ کارگر رہا کہ ابھی جنگ جاری تھی کہ ہوائی جہاز نے کھانے کا گجر بجا کر۔۔۔۔ "سیز فائر" کا اعلان کر دیا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی "ڈینور" کی روشنیاں نظر آ گئیں۔ گویا شب سیاہ میں صبح نجات طلوع ہو گئی۔ اب "حریف" سے دوستانہ مذاکرات شروع ہوئے۔ جہاز کے اترنے تک وہ جتنے کیڑے امریکہ کے نظام دفاع میں نکال سکتے تھے' نکال نکال کر ڈھیر کرتے رہے۔ "امریکہ گزشتہ پانچ برسوں میں دفاعی جارحیت" پر سینکڑوں بلین ارب ڈالر خرچ کر چکا ہے مگر جتنی دولت خرچ کی ہے اتنی طاقت اس میں نہیں ہے۔ ویت نام میں ساٹھ ہزار امریکیوں کو گاجر مولی کی طرح کٹوا لیا۔ عراق کے زخم نہ جانے کب تک چاٹتا رہے۔ امریکہ کی چھ لاکھ فوج میں بمشکل ستر ہزار ایسے لڑیت نکلتے ہیں جو محاذ جنگ پر کھڑے ہو سکیں۔ ان کی لش لش کرتی وردیوں پر مت جاؤ۔ اندر سب پھرا ہے۔ جو میدان جنگ میں خود اپنی فوج کا راستہ روکتا ہے۔"۔

اجنبی کا لیکچر دھواں دھار چل رہا تھا۔ یہاں نہ معلوم انہیں کیا خیال آیا کہ ہم سے پوچھ لیا "آپ کا ملک؟"

"پاکستان"

"ہوئی نا بات"۔۔۔ وہ شطرنج کو بریف کیس میں رکھتے ہوئے بولے۔۔۔۔ "یہ ہیں نا لڑنے والے لوگ۔ پاکستان۔ افغانستان۔ انڈیا۔ برما وغیرہ۔۔۔ آپ لوگ حوصلے سے لڑتے ہیں۔۔۔ امریکہ ساز و سامان پر اتنا زیادہ تکیہ کرتا ہے کہ تہران میں اپنے سفارت خانے پر "کمانڈو آپریشن" کرتے ہوئے جب پتہ چلا کہ ایک "ہیلی کاپٹر" تو امریکہ ہی میں رہ گیا تو ساری "کمانڈو فورس" کی گھگھی بندھ گئی۔ اپنے یرغمالی تو کیا نکلواتے' الٹے اپنے آٹھ آدمی ہلاک کروا لئے۔

جہاز اتر رہا تھا۔ ہم نے سوچا جاتے جاتے آخر میں کچھ کہنا چاہیے۔ ایک کہاوت یاد آ گئی۔ عرض کیا:

"تہران میں امریکیوں پر جو کچھ گزری۔ ہمارے ہاں ایسے موقعوں پر ایک

ادا جعفری' شوکت یوسف' نورالحسن جعفری کے ہمراہ

کہاوت کہی جاتی ہے کہ بکری سینگ بنوانے گئی تھی کان بھی کٹوا آئی"

تیر (بلکہ پھول) نشانے پر لگا۔ وہ ایک دم اچھلتے اور ہنستے ہوئے بولے۔

"واہ واہ۔۔۔۔ ہمارے ہاں بھی اس مضمون کی ایک کہاوت سفید ریچھ کے بارے میں مستعمل ہے۔۔۔۔ اچھا لوان کے اس عہد کے سب سے بڑے سپاہی جنرل میکارتھر کا ایک لطیفہ سن لو..... مگر لطیفہ ہوائی جہاز کی خاصی ناہموار "لینڈنگ" کے دھچکے میں اچھل کر رہ گیا۔ اترے تو راہداری میں ہاتھ ملاتے ہوئے بتایا۔۔۔۔ "پرسوں میں ڈینور یونیورسٹی میں چینی ماہر حرب۔۔۔ "لی گاؤ تاؤ"۔۔۔ کی نئی عسکری تھیوری پر لیکچر دے رہا ہوں' اگر آپ آ سکیں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ اپنا تعارفی کارڈ بھی دیا۔ پروفیسر..... مشیر دفاع حکومت سویڈن۔۔۔ گویا وہ اپنے ملک کے کرنل غفار مہدی تھے۔ انہیں کی طرح نام کے ساتھ علمی اور جنگی اعزازات کی ایک لمبی قطار بھی دور تک چلی گئی تھی۔ (۱۰ دسمبر)

تذبذب کی دلدل

دن بھر آرام کیا۔ بس اخبار "مشین" سے خریدنے سڑک تک گیا۔ کچھ وقت ماضی کے ساتھ کھیلا۔ ایک مہینے کی سیاحت کے مشاہدات و تاثرات ذہن میں رینگنے لگے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم زندگی کی روحانی اور مادی سطحوں پر لٹک رہے ہیں' جس طرح کوئی آدمی پھانسی پر جھولتا ہے۔ دونوں راستے مختلف منزلوں کو جاتے ہیں۔ امریکہ جسم ہی جسم' جان ہی جان بس ہی بس۔۔۔ اور ہم اشیاء محسوسات اور اعمال کی ایک دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ شہر میں پھسلنے لگتے ہیں۔ تو گاؤں میں چلے جاتے ہیں۔ قبلہ والد صاحب نماز کے مصلیٰ پر بیٹھے سامنے آ

جاتے ہیں۔ جن سے کوئی بات منوانے کے لئے ہمیں کبھی اونچی آواز میں بولنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مگر یہاں آکر تو بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے اچھائی اور برائی کی "اکائی" ٹوٹ گئی ہے۔ ہم ملحد تو قطعاً "نہیں۔ البتہ "ملامتی" (شائد مزاحمتی) ضرور رہے۔ حج بھی کئے۔ روضہ رسول پر حاضری کی سعادتیں بھی حاصل رہیں مگر صلواۃ میں باقاعدگی نماز فجر سے آگے نہ آسکی۔ سوچ کی لہروں نے بہت زچ کیا تو ہم نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کرلیں کہ اچھا چلو کیا یہی کافی نہیں کہ میں چل رہا ہوں۔ چلنے کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ آدمی کو کہیں پہنچنا بھی ہو۔ ہم تائب تو ہیں کہ ہمیں ہر چیز چینل دکھائی دے رہی ہے۔۔۔۔ کبھی چاند پر ہیں۔ کبھی زمین پر۔۔۔ زندہ باد ۔۔۔ امر عظیم۔ مرزا اسد اللہ خان غالب۔۔۔۔

کعبہ میرے پیچھے کلیسا میرے آگے

(11دسمبر)

ان کے گھر پر بھی مبارکباد دینے والوں کا ایک میلہ لگا رہا۔ تعزیرات فوجداری کی طرف سے صفائی کے بعد جیسے کوئی اخلاقی دھبہ اس کے دامن پر باقی نہ رہ گیا ہو۔ خوبرو سمتھ کو تو اب ملک میں ایک "ہیرو" کا خیر مقدم مل رہا ہے۔ جسٹس تھامس اور انیتا کی "جنسی جھڑپ" کے بعد امریکہ کے اخبارات اور "ٹیلی ویژن نیٹ ورک" پر اس مقدمے کی کارروائی کی بھی حرف بہ حرف تشہیر کی۔ اس میں بے شک "فروغ فلاؤ" کا جذبہ بھی کار فرما تھا۔ مگر ذرائع ابلاغ کی آزادی کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ سمتھ کینڈی۔۔۔۔ صدر کینڈی کا حقیقی بھتیجا تھا۔ اس کا ایک چچا "سینٹر" ہے اور دوسرا "کانگرس" "کارکن۔ اس خاندان کی دولت کا کوئی اندازہ نہیں۔ ذرائع ابلاغ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سمتھ کی پشت پر اگر اثر و رسوخ کے یہ تمام وسائل موجود نہ ہوتے تو ممکن ہے کہ عدالت کا فیصلہ مختلف ہوتا اگرچہ یہ مختلف فیصلہ بھی قانونی طور پر درست ہوتا۔ ججوں کو تو بہرحال گواہی کے شواہد و حقائق کی پابندی کرنا تھی۔ اور

۷۷ ویں سالگرہ کے موقع پر تقریب سے مخاطب جناب اکرم ذکی' سید ضمیر جعفری' ڈاکٹر جمیل جالبی' مستنصر حسین تارڑ' بیگم ثاقبہ رحیم الدین' محترمہ شبنم شکیل' متین فکری' عکسی مفتی' سلطان رشک' اور گلزار جاوید

ایک اور جنسی ڈرامہ

امریکہ کے مشہور مقبول مقتول "صدر کینڈی کے خاندان کا ایک محبوب صورت اور کھلنڈرہ نوجوان ولیم کینڈی سمتھ زنا بالجبر کے مقدمے میں پھنس گیا تھا۔ سمتھ نے "ارتکاب" کا تو خود اقرار کیا مگر "پیش دستی" سے انکار کیا۔ بلکہ ایک طرح سے "نیک ترسی" یا "انسان دوستی" کا مظاہرہ قرار دیا کہ ع

وہ جو کہتی تھی کہ پی تھوڑی سی پی میرے لئے

عدالت نے اس موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس خوبصورت نوجوان کو صاف بری کردیا۔ یہاں "زنا" جرم نہیں۔ "زنا بالجبر" جرم ہے۔ سو وہ "گردن مینا" پہ خون خلق ثابت ہی نہ ہو سکا۔ مقدمے کی سماعت میں سمتھ کی والدہ عدالت میں موجود تھی۔ بریت کا فیصلہ سنتے ہی اس خاتون نے جس فاتحانہ گرمجوشی سے سمتھ کو گلے لگایا اور مبارکباد دی اس پر یوں لگتا تھا جیسے ماں بیٹے سے کہہ رہی ہو ع

میرے شیر ہو تجھ پر رحمت خدا کی

سمتھ کے مقدمے کی پیروی کرنے کے لئے امریکہ کے ایسے ایسے چوٹی کے وکلاء موجود تھے' جن کے ہاتھ میں قانون موم کی ناک بن کر رہ جاتا ہے۔ سمتھ پر زنا بالجبر کا الزام فلوریڈا کی ایک دوشیزہ نے لگایا تھا۔ اخبارات اور ٹیلی ویژن نے بدچلنی کے اس مقدمے میں اس اخلاقی قدر کو بھی ملحوظ رکھا کہ نہ تو لڑکی کا نام لیا نہ اس کا چہرہ دکھایا نہ اس کے خاندان کا چرچا کیا اگرچہ اشاروں کنایوں میں اس کے چندے آفتاب' چندے ماہتاب خدوخال کے تذکرے کس کس رخ اور پیرائے میں نہ ہوئے۔ لڑکی نے عدالت کو رو رو کر سمتھ کی "زیادتی" کی روداد سنائی کہ کس طرح ایک شبینہ طرب خانے میں ایک رات اتفاقاً" اس کی ملاقات سمتھ سے ہو گئی۔ اس نے مجھے رقص کی درخواست کی۔ کچھ دیر ہم رقص کرتے رہے۔ جس کے دوران میں وہ مسلسل میرے حسن و جمال بالخصوص میری آنکھوں کی خمار افروزی کی تعریف کرتا رہا۔ ہم شراب کے نشے میں دھت تھے۔ مگر اس کے باوجود اس نے

رقص میں اپنے جسم کو میرے "ابھار" سے ایک "تہذیبی فاصلے" پر رکھا۔ حالانکہ اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت اور سانسوں کی گرمی بھی مجھے "گھائل" کر رہی تھی۔ رقص کے بعد جب اس نے ساحل سمندر پر گشت کی دعوت دی تو میں دراصل اس کی شخصیت سے اتنی مسحور تھی کہ میں ساتھ چل پڑی۔ وہاں ہم کچھ دیر ایک محل نما مکان کے سامنے جو اس کا گھر تھا، سبزہ زار میں سمندر کے منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کہ یکایک اس کے اندر کا درندہ میرے اوپر جھپٹ پڑا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ میری آبروریزی کی۔ میں نے کچھ مزاحمت تو کی مگر شرار۔۔۔ شعلے سے کیا الجھتا۔ شور بھی مچایا۔ گھر کا ایک بالائی دریچہ کھلا بھی تھا۔ مگر۔۔۔ کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ میں نے اپنی عصمت کے جس شیشے کو اتنی مدت تک بچا بچا کر

احمد فراز اور سید ضمیر جعفری

رکھا تھا، وہ ایک دھچکے میں چور چور ہو گیا۔۔۔ ٹیلی ویژن کے کیمروں نے اس کے کسی آنسو کو زمین پر نہ گرنے دیا۔ اس کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کی بارش براہ راست ناظرین اور سامعین کے دلوں پر برستی رہی۔

سمتھ کی باری پر بھی لوگ جگر تھام کر بیٹھ گئے۔ اس نے لڑکی کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "بے شک ہوئی مگر آبروریزی اس کی نہیں۔ میری ہوئی۔ ترغیب و تحریک اس کی طرف سے ہوئی۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں ایک خاتون کی خواہش کو رد نہ کر سکا۔ سمندر کا ساحل تھا، چاندنی رات تھی۔ جوانی کا الاؤ دونوں طرف دہک رہا تھا۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ع

[illegible] چند گرد راہ گزر تو دیکھو!

ورنہ میں اتنا بھی ناہنجار نہیں کہ گھر میں میری ماں کی خواب گاہ کا دریچہ کھلا ہو اور میں۔۔۔ مگر۔۔۔ جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں۔۔۔۔ میں پیالہ دہ چہرۂ تو نہیں تھا۔۔۔ می لارڈ۔۔۔ مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ میں ایک اجنبی لڑکی کے طلسم کا اسیر ہو گیا۔ لیکن میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کینڈی نے عدالت کو بتایا کہ جاتے ہوئے اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔ " میں بہت خوش وقت ہوئی۔ تم غضب کی چیز ہو۔"

اس مقدمے کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ فیصلہ ایک خاتون جج نے صادر کیا۔ پانچ رکنی جیوری میں بھی تین خواتین شامل تھیں۔ استغاثے کی بڑی وکیل بھی ایک خاتون ہی تھیں۔ گویا ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

نیویارک سے شفیق احمد خان اور بوسٹن سے سرور اقبال نے حال احوال پوچھا۔ سرور نے ٹیلی فون پر ن م راشد اور فیض کے کتنے شعر سنائے۔ (12 دسمبر)

امریکہ میں لاٹھی چارج

ڈینور کے ایک فلاحی ادارے نے غریب بچوں میں کرسمس کے لئے کھلونے تقسیم کرنے کا اعلان کیا تو ادارے کے دروازے پر ہزارہا غربا جمع ہو گئے۔ اس "وہم" میں مبادا کھلونے ختم ہو جائیں یا اچھے کھلونے دوسرے لوگ لے جائیں۔ لوگوں کا ایک ہجوم براہ راست کھلونوں پر ٹوٹ پڑا۔۔۔ نوبت پولیس کے لاٹھی چارج تک پہنچی۔ جس میں کھلونوں کے ساتھ چند تماشائی بھی ٹوٹ گئے۔

ہمارے گھر کے سامنے باغیچے کی برف میں دس بارہ برس کا ایک میکسیکی لڑکا کھیل رہا تھا۔ ہم نے نام پوچھا۔

"دامنے"

معنی پوچھے

"خوشبو"

(13 دسمبر)

میرے اپنے دل میں اپنے لیے کوئی عزت نہیں ہے۔ مگر جب محترمہ پروین شاکر نے مجھے اس تقریب میں اظہار خیال کے لیے کہا تو اپنی ساکھ اپنی نظر میں بھی ہمک اٹھی۔ پروین شاکر۔ اب شعری منزلت کے اس زینے پر نہیں ہے کہ آدمی اس "بی بی" کو "بے بی" "نور چشمی" وغیرہ کہہ کر "لانبھے" ہو جائے۔ اس کے شعر کی خوشبو سے تو جدید اردو شاعری کا سارا گلستان مہک رہا ہے بلکہ بہت سی طوطیاں اور عندلیبان اس کے لہجے کو "اڑا کر" اب اسی کے پروں پر اڑ رہی ہیں وہ ان چند آوازوں میں سے ہے جن کو اس دور کی شعری دریافت کہنا چاہیے منصف حکمران اور اچھے شاعر کے درمیان بھی ایک قدر مشترک ہوتی ہے وہ یہ کہ آدھا ملک منصف حکمران کے خلاف ہو جاتا ہے اور اسی طرح ملک کے آدھے شعرا ---- اچھے شاعر کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ تو اس زاویے سے بھی۔ افکار کی شاعرہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لڑکیاں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ پروین تو شاعری کے حساب سے پیدا ہی جوان ہوئی ہے۔ ملک خداداد پاکستان کے مانند جیسے کہ ملک نیا قوم پرانی۔

پروین شاکر۔ شاعری کے "غیر مقلدین" میں سے ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ امر اس کی غیر معمولی اہمیت کی دلیل ہے کہ اسے۔ اس قدر وسیع پذیرائی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی۔ اور ماشاءاللہ بہت جلد ملی۔ ورنہ کلیہ یہ ہے کہ "مقلدین" کی پذیرائی (جیسا کہ استاد ذوق "عموماً ان کی زندگی میں ہوتی ہے اور غیر مقلدین کا غلغلہ "راولا رپا" وغیرہ۔ (جیسا کہ میرزا غالب کا) مرنے کے بعد۔

تو "افکار" پر اظہار خیال کرنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ مگر ہر اعزاز کی طرح ایک آزمائش بھی ہے۔ یہ وہی فرق ہے جو اعزاز اور اعتراز میں ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس تقریب کا اہتمام "دائرہ" نے کیا ہے۔ تقریب طرازی کی سبیل سے "دائرے" کے سینے پر "کانسی اور تانبے کے تمغوں" کی تو لمبی قطاریں لٹک رہی تھیں مگر "طلائی تمغے" اس انجمن نے اب تک بمشکل دو تین ہی کمائے ہوں گے۔ بارے کہ اس کی فرد عمل میں آج ایک بہت روشن تمغے کا اضافہ ہو گیا۔

اصولی طور کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ اچھی کتابیں۔ یا بری کتابیں۔ البتہ فروعی جھگڑا یوں نکل آتا ہے کہ۔ ہم سوچتے تو اجمال میں ہیں اور رہتے تفصیلات میں۔ ہیں مطلب یہ کہ بعض کتابیں چبا چبا کر پڑھنے والی ہوتی ہیں اور بعض بس غڑاپ سے پی جانے والی کہ ادھر حلق سے اتریں اور ادھر ہضم۔ مگر "افکار" ان بیک وقت لذیذ اور فکر انگیز کتابوں میں سے ہے جو کھائی بھی جاتی ہیں اور چبائی بھی جاتی ہیں۔ یعنی یہ قاری کو بار بار اپنی طرف بلاتی رہتی ہے۔ ایسی شاعری ہے کہ پریاں شعر شعر پر۔ نقاب الٹ رہی ہوں عہدہ بر آ ہونا کار دارد۔ میری کیفیت اس عمل میں کچھ وہی ہوئی جو ایک مرتبہ محترم دوست (ممتاز دانشور شاعر کالم نگار اور حکومت پاکستان کے ایک سابق سیکرٹری وزارت داخلہ) چوہدری فضل حق صاحب کی ہوئی تھی جب وہ ایک نوجوان پولیس افسر کی حیثیت سے کسی کورس پر انگلستان گئے تو برطانیہ کے تاریخ ساز وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل سے "خصوصی انٹرویو" کا "پنگا" لے بیٹھے۔ خدا معلوم چوہدری فضل حق نے مسٹر چرچل کو کس طرح "ہینڈل" کیا۔ میں تو اپنے اس بحران میں سے اس طرح نکلا ہوں جس طرح دریا میں ڈوبنے والے آدمی کو بعض اوقات خود لہریں اچھال کر کنارے پر پھینک جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سراسیمہ آدمی سے آپ گفتار میں کسی ترتیب کی توقع نہیں کرسکتے۔ البتہ گزارشات اگر کسی قدر طویل ہو جائیں تو اس کے لیے درگزر کا خواہاں ہوں۔ بری عادت آسانی سے نہیں چھوٹتی میں اگر خدانخواستہ کسی روز چار پانچ منٹوں میں اپنے مقالے کے مرکزی نکتے تک پہنچ گیا تو مجھے ڈر ہے کہ میرے لکھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے گی۔

دشواریاں کئی تھیں۔ پہلی تو وہ دشواری تھی جس کی نشان دہی خود پروین نے اپنے ایک مصرعے میں اس طرح کی ہے۔

سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

یہ تو خیر فکری دشواری تھی مگر ایک جغرافیائی گھاٹی بھی خاصی دشوار گزار نکلی۔ وہ تھی مقالے کی چنائی کے لیے اشعار کے چناؤں کی مشکل۔ یہ اس قسم کی دشواری تھی جو زندگی میں اکثر آدمی کو محسوس ہوتی ہے کہ دنیا میں خوبصورت عورتیں بہت ہوتی ہیں اور وقت کم ہوتا ہے۔ اس شعری مجموعے میں بھی خوب صورت اشعار کی تعداد بہت زیادہ تھی اور میرے پاس، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ وقت کم بلکہ بہت کم ہے۔ مجبوراً صرف چند اشعار پر اکتفا کیا۔

لشکر کی آنکھ مالِ غنیمت پہ ہے لگی!
سالارِ فوج اور کسی امتحان میں ہے
اُس کا بھی دھیان، جشن کی شب اے سپاہِ دوست
باقی ابھی جو تیرے عدو کی کماں میں ہے
مسند کے اپنے پاس نہ جائیں کہ پھر کھلے
وہ بے تعلقی جو مزاجِ شہاں میں ہے
اب تو فقط قیاس سے راہ کوئی نکالی جائے
جن میں تھیں کچھ بشارتیں خواب تو وہ تلف ہوئے
یہ بھی کیا کم ہے کہ اپنی جنگ میں تنہا نہیں
کار زارِ زندگی میں میرا اک لشکر تو ہے
راہِ دشوار کی جو دھول نہیں ہو سکتے
ان کے ہاتھوں میں کبھی پھول نہیں ہو سکتے
حاکمِ شہر کے اطراف وہ پہرہ ہے کہ اب
شہر کے دکھ اسے موصول نہیں ہو سکتے
دینے والے کی حقیقت پہ ہے سب کچھ موقوف
مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی
گھر ڈوب گیا اور انہیں آواز نہیں دی
حالانکہ مرے سلسلے اس پار بہت تھے
ہم اہلِ حاجت وار بابِ احتیاج تو کیا
قبیلہ شہر بھی اب حبِ زر پہ زندہ ہیں
اس پھول میں اک پھول کھلا میرے لئے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا
مرے قبیلے میں نکلے سبھی فروختنی
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی اصول باقی ہے
ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا
رستے میں مل گیا تو شریکِ سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہو اسے اپنا گھر نہ جان
دکھ سے بھری ہے لیکن میسر تو ہے حیات
اس رنج کے سفر کو بھی بارِ دگر نہ جان
گھنے درختوں کے گرنے پہ ماسوائے ہوا
عذابِ دربدری اور کون سہتا ہے

مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے
ہوا کا زور کسی شب تو جا کے ٹوٹے گا
بچا کے رکھتا ہے کوئی دیا مکاں کے لئے
سفر کے باب میں کتنے عجیب لوگ ہیں ہم
کہاں کا قصد کیا، چل پڑے کہاں کے لئے
ہوا پہ لکھا ہوا حرف ہی تھی دنیا
تمام رنگ اسی نقش رائیگاں کے لئے
پیوند کہاں تک لگیں اب خرقۂ غم کو
اس پرسشِ رسوائی کو تبدیل کیا جائے
اک چادرِ دلداری ہے اس طرح سے مجھ پر
تن ہے کہ جو الجھا ہے سر ہے کہ کھلا جائے
اے گردشِ دوراں ترے احسان بہت ہیں
کچھ دیر ترے ساتھ بھی اب رقص کیا جائے
جیسے کوئی عقب سے بلاتا ہے بار بار
بچپن سے اک عجیب سرابِ صدا میں ہوں

"انکار" میں غزلیں بھی اور نظمیں بھی، سچائی کا جوہر اپنے مختلف مظاہر میں، دونوں طرف برابر روشن ہے۔ جذبے کا الاؤ بھی۔ اظہار کی خوشبو اور چاندنی کا رقص بھی، مجھے اس کی غزل زیادہ مرغوب معلوم ہوئی۔ میرے نزدیک اس "شہر نوا" کا مرکزی آہنگ، بلکہ "چنبیلی چوک" غزل ہی ہے۔ تقابل مقصود نہیں مگر غزل گاڑھی اور گھنی ہے۔ نظم کھلی اور کھلیانی۔ ہر گل را رنگ وبوے دیگرے ----- غزل آدم گری کرتی ہے اور نظم شیشہ گری ----- یہ وہی فرق ہوا جو نغمہ خوانی اور جہازرانی میں ہے ---- "انکار" کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ خواہ ----- کسی شاخ سبزکی اوڑھنی پر ہلکی سی گوٹ لگی ہو" ---- یا ---- دیار غزال چشماں وگل عذاراں کی بشارتیں ہوں"

"یورپ کے کوہستانوں میں برف پگھل رہی ہو" ---- یا ---- "کسی شہزادی کا المیہ" ----- یا بے شک کہیں "انقلاب کی آگ بھڑک رہی ہو ----- الغرض جو بھی کچھ ہو، بس اسی قدر ہوتا ہے کہ شاعری کے لئے بھی وہاں بہت وافر جگہ موجود رہتی ہے۔ پاکستان کے ----- "فیوڈل لینڈ لارڈوں" ---- والی بات نہیں ---- کہ ملک بیشک ختم ہو جائے مگر "جاگیر" ختم نہ ہو۔ پروین شاکر ایک انقلابی شاعرہ ہے مگر اس کے شعر میں نعرے کا واویلا ----- دھیمے سروں ہی میں رہتا

ہے۔ اس کے ہاں "رباب" کا انقلاب ہے "ڈھول کا انقلاب" نہیں ہے۔ اُس شہر میں جمہوریت تو آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں آٹے کا تھیلا بھی ہوتا ہے "نئی دنیا کیلئے بشارتیں اور سماجی معاشی عدل مع روٹی' کپڑا اور مکان وغیرہ کے" مگر تھیلا ریشمی جارجٹ کا ہوتا ۔۔۔۔ پروین شاکر کا ایک شعر ہے ؎

تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمل!
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی ہوں

پروین شاکر کوئی سطحی شاعرہ نہیں کہ اس کے فن و فکر کے مختلف زاویوں کا مکمل جائزہ آسانی سے گرفت میں آسکے۔ تاہم تین دھارے جن کو آشوب ذات' آشوب کائنات اور آشوب وطن کے حوالوں سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔ پہلو بہ پہلو بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ آشوب ذات کی نسبت سے نسائی حیات و محسوسات کے جو سائے "انکار" میں جھلکتے ہیں اور عورت کی آواز جو کرب اس کے اشعار میں تڑپا ہے' وہ ایسی سندرتا' جرات اور گمبھیرتا کے ساتھ کہیں کہیں ہی دیکھنے اور سننے میں آیا ہے۔ پروین شاکر اردو شاعری کی غالباً وہ پہلی منجھی شاعرہ ہے جو غزل میں "اردو غزل کے عاشقوں" جیسے شعر کہتی ہے کہ صداقت اس کے فن کا بنیادی جوہر (بلکہ آدرش) ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اپنے ایک شعر میں پروین نے یہ تک بتا دیا کہ وہ اب اپنی عمر کے ۔۔۔ "کتنے جیسے" میں ہے ۔۔۔ یہ بات کوئی غیر معمولی بہادر خاتون ہی کہہ سکتی ہے۔

اس نے ایک نظم میں ۔۔۔ انسانوں کے روپ میں بھیڑیوں کا ذکر کیا ہے' جن کے غول' اس کے اطراف منڈلاتے رہتے ہیں۔ اس کی زندگی جتنی حقیقی

کرنل محمد خان اور ایک دوست کے ہمراہ

خوشحال خان خٹک کے مزار پر

سرگزشت خود اس کے شعروں سے نچوڑی جاسکتی ہے۔ عہد حاضر کے بہت کم شعراء کے دواوین میں ملے گی۔ شاید اسی لئے اس نے منظومات پر تاریخیں نہیں دیں۔ اس کے ہاں اداس نظمیں بھی ہیں ۔۔۔ اور شریر نظمیں بھی ہیں ۔۔۔ اداس نظمیں ۔۔۔ اداس تو بہت کرتی ہیں۔ مگر آرزوئے حیات کی چنگاری کو بجھنے نہیں دیتیں' اگرچہ زندگی ہمیشہ اس کے لئے چھوٹی چادر رہی ہے ؎

ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ
اس شہر بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

اور

زمینِ دل یونہی شاداب تو نہیں اے دوست
قریب میں کوئی دریا ضرور بہتا ہے

"شریر نظمیں" خاصی شریر اور چنچل ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ احرام پہن کر لکھی گئی ہیں مگر فن کی خوب صورت رفوگری کے طلسم سے ان میں وہ بات بھی نہیں کہ شعر پڑھتے ہی آدمی گنہگار ہو جائے۔ ؎

میں تو تا عمر ترے شہر میں رہنا چاہوں
کوئی آکر ۔۔۔ مرا اسبابِ سفر تو کھولے

آفاقیت کے سفر کے بغیر کوئی شاعری مشتری' مریخ کے مدار میں داخل نہیں ہو سکتی اور یہ سفر اس کے ہاں نگاہ کی ایسی بے تابی اور لفظ کی دل نوازی کے ساتھ موجود ہے کہ خاندان اور نسل تو کیا معنی ۔۔۔ کہیں کہیں وہ قوم اور ملک کے "زندانوں" سے بھی نکل جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ کراچی کے سانحات پر اس درد سے

روتی ہے کہ جیسے اقبال غرناطہ پر رویا تھا۔ اس کی نظم ---- "سندھ کی ایک بیٹی کا اپنے رسول سے سوال" ---- پاکستان کے ---- "سانحاتی ادب" میں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ وطن کی محبت کا سوتا اس کی زمین شعر سے بار بار پھوٹتا ہے اور دیکھئے کہ اخلاص کی کیسی بے ساختہ وارفتگی کے ساتھ ۔

زندگی کی دھوپ میں اس سر پہ اک چادر تو ہے
لاکھ دیواریں شکستہ ہیں پہ اپنا گھر تو ہے
جو بھی آئے گا یہاں دستک تو دے کر آئے گا

اکبر الٰہ آبادی اکیڈمی اسلام آباد کی تقریب میں چار مزاح نگار سرفراز شاہد، ضمیر جعفری، انور مسعود اور انعام الحق جاوید،

اِک درِ دیوار تو ہے، اک حصارِ در تو ہے

ملک پر مارشل لاء کا تسلط پروین شاکر کی روح کا سب سے بڑا گھاؤ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی اگر سب نہیں تو بیشتر نظمیں مارشل لاء کی طویل رات میں لکھی گئی ہیں۔ یہ گویا مارشل لاء کے خلاف جمہوریت کے ایک "لانگ مارچ" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مارشل لاء کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو یہی کہ پروین نے قلم کو ---- "کلاشنکوف" بنالیا اور وہ اردو شاعری کی "سیفو" بنتے بنتے اردو شاعری کی "رانی جھانسی" بن گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے کے ایک مقبول عوامی گیت کا یہ مصرعہ ہم پروین شاکر کے لئے بھی دہرا سکتے ہیں کہ

۔ خوب لڑی مردانی ---- رانی جھانسی کی

اس کی گہری اداسی بھی مارشل لاء کی پیداوار ہے۔ میرے لئے یہ بات ایک انکشاف تھی کہ حکومت نے اس کو ملک سے باہر جانے سے روکا تھا۔ یہ تو اس کی ہمت تھی کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے، کسی نہ کسی غیر ملکی مشاعروں میں پہنچتی رہی۔

ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے بھی 'اپنی مجبوری کے احساس پر وہ بہت آزردہ دکھائی دیتی ہے "انکار" کی مصنفہ ---- سرکاری ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے "انکار" تو نہ کر سکی۔ مگر وہ سرکاری جبر کے خلاف نظمیں لکھتی رہی اور جہاں جہاں اسے بولنے کا موقع ملا وہ برملا بغاوت بولتی ہی رہی ---- اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے جن اہل قلم نے ---- آمریت کے کوڑے کے کس بل نکالنے میں مجاہدانہ جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں پروین کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ چاہتی تو' باہر جا کر جرمنی کی جنگ جاپان سے بھی لڑ سکتی تھی 'مگر اس نے جمہوریت کا معرکہ "سٹالن گراڈ" اپنے شہروں کے گلی کوچوں ہی میں رہ کر لڑنے کو ترجیح دی۔

پروین کی "مارشل لائی نظموں" ---- میں سے ایک نظم مجھے آج کی صورت

حال میں خصوصی طور پر یاد آگئی۔ میں یہاں اس کی صرف ایک "لائن" ہی نقل کر رہا ہوں کہ نظم کا سارا "تت" "سمٹ کر اسی ایک "لائن" "میں آگیا ہے۔ اور وہ یہ کہ!

"اے خدا"!

میرے پیارے سپاہی کو سرحد کا رستہ دکھا۔"

یہ نظم میرے ذہن میں شاید اس لئے شدت کے ساتھ ابھر آئی کہ اب ہم خود اپنے پیارے سپاہی کو سرحدوں سے بلا کر کراچی اور حیدر آباد کے شہروں میں ریت کی بوریوں کے دمدمے بنوانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اردو شاعری کی "رانی آف جھانسی" ---- جس دلیری سے آمریت کو للکارتی رہی تھی، اب جمہوریت کے شگافوں کی نشاندہی بھی کرتی رہے گی اور اپنے اسی مخصوص لہجے میں کہ: ۔

ایک سیلاب سے ٹوٹا ہے ابھی ظلم کا بند
ایک طوفاں کو ابھی زیر زمیں رکھنا ہے

اور بی بی!

اب خو گر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

پروین! ---- تمہیں یہ "نثری نظم" کا "دھماکہ" کرنے کی کیا ضرورت تھی ---- تجربات کا دریچہ بے شک ہمیشہ کھلا رہنا چاہیئے۔ مگر یہاں تو تجربہ کا "درہ خیبر" کھل گیا۔ یہ تو شاعری کی "ہارس ٹریڈنگ" ہوئی۔ جس کو مولانا شبلی نعمانی نے

انجمن ترقی اردو کی تقریب سپاس

"خرابازاری" لکھا تھا۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب کسی کالج کو اپنے طلباء میں دلچسپی نہیں رہتی تو اس کالج کو یونیورسٹی بنا دیا جاتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جس شاعر کو شاعری میں دلچسپی باقی نہیں رہتی، وہ نثری نظم لکھنے لگ جاتا ہے۔ شاعروں کی بنیادی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شاعری سے چمٹ جاتے ہیں، دوسرے وہ جو شاعری کو اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ آپ تو گرتی شاعری کو تھام لینے والی شاعرہ ہیں۔ اگر آبشار نیاگرہ سے بھی قطرہ قطرہ شبنم ہی رسنے لگی تو شاعری میں صرف "ہارس ٹریڈنگ" ہی باقی رہ جائے گی۔

ایک گلہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے میں اس کتاب میں وہ نظم ڈھونڈتا رہا جو آپ نے بریگیڈیر صدیق سالک کی رحلت پر لکھی تھی؟

تنقید کا خمار بھی اقتدار کے نشے سے کم نہیں ہوتا۔ میں یہ چند باتیں شاید اسی "خمار" میں کہہ گیا۔ نقادوں نے قلوپطرہ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ جب کہا کہ اگر اس بی بی کی ناک قدرے چھوٹی ہوتی تو تاریخ عالم کا چہرہ ہی بدل جاتا۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ "انکار" ہر معیار شعری کے حوالے سے نہ صرف عصری شاعری کا ایک درخشندہ نمائندہ مجموعہ ہے بلکہ اس سے شاعری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے اور اس اعتبار سے تو یہ ایک منفرد کتاب ہے کہ بہت لوگ اس کتاب کو بہت پسند کریں گے مگر بہت کم لوگ خوش ہوں گے۔ کیونکہ اس کے ہاں ہمارے بعض زنگ آلودہ معاشرتی، معاشی رویوں پر تنقید بھی موجود ہے اور ہم بحیثیت قوم تنقید سے سدھرنے کی بجائے تعریف سے تباہ ہونے کو پسند کرتے ہیں۔ مگر شاید اسی حوالے سے بعض طبقوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ارباب حکومت کے لئے تاکہ وہ سیکرٹریوں کی ترقی و تقرری کے معاملے میں اعلیٰ انسانی قدروں کو ملحوظ رکھا کریں ---- فوج کے جوانوں کو بھی اس کا ترجمہ پڑھوانا سود مند ہو گا۔ تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ ---- قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟ ---- اور اس کی عورتوں کے لئے تو یہ ایک خصوصی ادبی دستاویز ہی نہیں بلکہ ایک "منشور حریت" کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے اشعار میں ایک عورت ہی کا دل تو دھڑک رہا ہے۔ اور میں صدق دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ نہایت خوب صورت اور نہایت خیال انگیز شاعری کی یہ کتاب ہر دلہن کے جہیز میں شامل ہونی چاہیئے کیونکہ ----

"لوگ تو "گھراج" بھی جاتا ہے مگر لفظ کبھی نہیں کراچتا"

(19 جولائی 1990ء کو اسلام آباد میں "انکار" کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا)

کالم روئیت ہلال کمیٹی نے روزہ داروں کو "حلال" کر دیا

سید ضمیر جعفری

افتخار عارف سید ضمیر جعفری کی 77 ویں سالگرہ کے موقع پر اکادمی کی جانب سے تحفہ پیش کرتے ہوئے۔

۲۶ اپریل کو ہم محلے کے قریبی بازار کے دل بہار ہیئر سیلون میں گئے تو حجامتوں پر بہار آئی ہوئی تھی۔ مصروف لوگوں کو صفائی کے لئے اور خلیفہ کو کمائی کے لئے ایک اور دن مل گیا تھا۔ قینچی بھی چل رہی تھی اور زبانیں بھی۔ گفتگو کا موضوع' روئیت ہلال تھی۔ صوبہ سرحد میں آج عید منائی جا رہی تھی جب کہ پنجاب والوں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ پنجاب نے جہاں مرکز کی حکومت نہیں۔ مرکز کی بات مان لی مگر صوبہ سرحد نے جہاں مرکز کی حکومت تھی' مرکز کی بات نہ مانی۔ لاہور سے مرکزی روئیت ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق' چاند ملک بھر میں کسی جگہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ مگر کافی دیر کے بعد جب لوگ سحری کے پراٹھوں کی خوشبو اوڑھ کر خواب خرگوش میں پھسلنے لگے تو ٹیلی ویژن نے اعلان کیا کہ صوبہ سرحد میں چاند دیکھا گیا ہے یوں اس مرتبہ بھی حکومت کے تمام انتظامات اور اخراجات کے باوجود کہ کتنے ہی علماء کرام کو نہ جانے کہاں کہاں سے ہوائی جہاز میں اڑا کر لاہور لایا گیا تھا۔ سارے ملک میں عید کی تقریب ایک دن نہ منائی جا سکی۔

سیلون میں دھواں دھار تبصرے جاری تھے اور تبصروں سے اس فرانسیسی مفکر کے اس قول کی تصدیق ہو رہی تھی' جس نے کہا تھا کہ..... "فرانس کے چالیس ملین عوام کبھی غلط نہیں ہو سکتے"

ہمیں چند تبصرے اور ایک واقعہ یاد رہ گیا تبصرہ یہ تھا۔

"اپنا چاند اور اپنی عید"

"ٹیلی ویژن کو دوش نہ دو۔ ٹیلی ویژن کا کام اعلان کرنا ہے نماز عید پڑھوانا نہیں ہے۔"

مرکزی وزیر اوقاف خان بہادر خان کمیٹی میں موجود تھے۔ وہ صوبہ

میں سرخوشی کی ایک لہر پیدا کیا کرتا تھا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ چلے تھے نمازیں بخشوانے اور الٹے روزے گلے پڑ گئے۔

اب واقعہ سنئے!

سیلون میں پندرہ برس کا ایک لڑکا ہمارے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ نوجوان نے حال ہی میں میٹرک کا امتحان دیا تھا ہم دونوں کے درمیان ایک اخبار کھلا رکھا تھا۔ ایک صفحہ وہ پڑھ رہا تھا دوسرا ہمارے زیر نظر تھا۔ ہم نے اپنا صفحہ ختم کر کے جب عزیزم کے صفحے پر ٹکٹکی باندھی تو ایک عجیب خبر دکھائی دی۔

سانپ نے آدمی کو گولی مار دی۔

صبر کا یارانہ رہا۔ نوجوان سے پوچھا عزیزم ذرا یہ تو بتاؤ کہ سانپ نے آدمی کو کس طرح گولی کا نشانہ بنایا کیا اب سانپ بھی تخریب کاروں میں شامل ہو گئے ہیں۔

عزیزم نے جواب دینے کے بجائے ہم سے سوال پوچھ لیا۔ بولا!

پہلے آپ یہ بتائیں کہ جب بنوں میں چاند ہو گیا تھا تو پورے ملک میں آج عید کیوں نہیں منائی گئی۔ کیا بنوں کا چاند اسلام آباد، لاہور، کوئٹے اور کراچی کا چاند نہیں ہے؟

اب وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آسکے

ممتاز مفتی اور غلام ربانی آگرو کے ساتھ ایک تقریب میں

سرحد کے رہنے والے ہیں۔ (یہ بات ایک پٹھان ہی کہہ رہا تھا) خان صاحب کو پتا ہونا چاہئے تھا کہ ہم تیس روزے پورے کر چکے تھے۔

"ہلال عید........ بادشاہ ہے۔ بادشاہ موجود ہے۔ مگر نظر نہیں آتا۔ شاہ نیپال کو ہم نے نہ جانے کتنی مدت کے بعد اگلے دن ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ حالانکہ کھٹمنڈو ہی میں رہتے ہیں۔"

لالہ مصری خان بھی سیلون کی چوپال میں موجود تھے۔ حسب معمول ان کی رائے طویل بھی تھی، وزنی بھی اور لہجہ فیصلہ کن فیصلہ یہ تھا کہ..... حکومت وہ اچھی ہوتی ہے جو عوام کے تو زیادہ سے زیادہ قریب رہے۔ لیکن عوام کے معاملات میں کم سے کم مداخلت کرے۔.....

مطلب یہ کہ ہلال عید کو اور عوام کو بانکپن کے رنگ میں چھوڑ کر حکومت خود ایک طرف ہو کر کسی گوشے میں بیٹھ جائے۔ چاند کو "قومیانے" کا تجربہ کچھ کامیاب ثابت نہیں ہوا کیا اس بات سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ رویت ہلال کمیٹی اور ہلال عید کے تعلقات برسوں سے مسلسل کشیدہ چلے آرہے ہیں۔ کمیٹی سے قبل ہلال عید کی رویت پر چند مولوی صاحبان میں جھگڑا ہوتا تھا۔ اب تو ہلال عید کے نکلنے سے صوبائی خودمختاری کا مسئلہ نکل سکتا ہے اور اس حالت میں کہ ملکی آئین میں ہلال عید کے بارے میں کوئی صراحت موجود نہیں کہ اس پر صوبوں کو اختیار ہے یا مرکز کا اقتدار۔ ہلال عید کو وزیراعظم سے پوچھ کر نکلنا ہو گا یا صدر مملکت سے؟

"رویت ہلال کمیٹی کے قیام سے وہ ارمان انگیز رومان بھی ختم ہو گیا جو گھروں کی منڈیروں، مسجدوں کے میناروں پر چڑھ کر اور درختوں کی پھنگوں سے لٹک کر، ہلال عید تلاش کرنے میں ہماری رگ و پے

دادا اور پوتے کا رومانس

نامے ضمیر

147-45 (C),
Village Road,
JAMAICA 35,
L.I., N.Y.

۵ جون ۱۹۵۳ء

پیارے ضمیر — یہ انگریزی میں ٹائپ شدہ خط لکھنے کا تکلف سمجھ میں نہیں آیا۔ نیا نیا ٹائپ رائٹر خریدا ہو تو اور بات ہے۔ پہلی جون کی صبح کو صفیہ اور بچے یہاں آدھمکے۔ ویسے خیریت سے پہنچ گئے لیکن ابھی تک راستے کی تکان دور نہیں کر سکے۔ ان کے لیے یہ ماحول اتنا نیا اور اتنا مختلف ہے کہ خود میرے لیے بھی رہا تھا۔ لیکن امید ہے آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہو کر لگاؤ پیدا ہو جائے گا۔

یہاں تمہارا ذکر اکثر رہتا ہے۔ آفتاب نقوی جو تمہارے ساتھ سنگاپور میں تھے، آج کل یہاں اقوام متحدہ کے فلم یونٹ میں کام کر رہے ہیں۔ وہ تمہاری نئی عادتیں اور نئی "خفیہ" باتیں سناتے رہتے ہیں۔

کاکول میں کیا کر رہے ہو؟ کیا حسن ابدال کے بارے میں کتاب لکھ چکے؟ اگر ایسا ہوا تو تمہارے ذہن کی نشوونما کے لیے برا نہیں ہوگا۔

صفیہ تمہیں دعا دے رہی ہیں۔ شہریار کا ادب سے سلام!

مخلص، راشد

پروفیسر ایش کمار   بہار (بھارت)

پیارے ضمیر!

تمہارے خط سے تمہاری "چہار سو" کی ایڈیٹری کی خبر ملی۔ یہ کوئی نئی خبر نہیں کچھ نہ کچھ خبر میں تم ہمارے ملک میں بھی رہتے ہو۔ تمہارے روشن ادبی ریکارڈ پر قدرتاً دل خوش ہوتا ہے کہ آخر یہ پودا ہمارا ہی لگایا ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے ہی تمہیں گورنمنٹ کالج اٹک کے میگزین "مشعل" کی ایڈیٹر کے لئے منتخب کیا تھا۔ میں چہار سو میں کیوں نہیں لکھوں گا۔ تمہارے پرچے کے معیار یا مزاج کو دیکھنے کی مجھے ضرورت نہیں بس تھوڑی سی مہلت چاہتا ہوں۔ ان دنوں گرمی نے پریشان کر رکھا ہے۔ ہم فولاد کے کارخانے کی بستی میں رہتے ہیں۔ یعنی گرمی میں اور بھی گرمی۔ تمہارے کیمبل پور کے زمانے کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
یعنی تیزی میں اور بھی تیزی

کئی مہینے ہوئے میں نے تمہیں ایک طویل خط لکھا تھا تمہارے ایک طویل سوال نامے کے جواب میں۔

یاس کہتی ہے کہ تیرا نامہ برا مارا گیا
آس کہتی ہے میرے خط کا جواب آنے کو ہے

تمہارا خیر اندیش

مولانا نعیم صدیقی

تازہ "چہار سو" کے ساتھ آپ کا مکرمت نامہ بھی ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھی سکوت پسند کم گو اور کم علائق آدمی ہوں خصوصاً علمی ادبی اور سیاسی و افسر شاہی بھی) دنیا کی بڑی شخصیتوں سے بات بنانے اور رابطے بڑھانے میں تیسرے درجے سے بھی کم تر ہوں۔ آپ کی شخصیت نے اپنے مخصوص وسیع الظرف مزاج اور حقیقی مزاح پسند ذہن اور "کثرت آمیز" (بخلاف کم آمیز) طبیعت کی وجہ سے خاصی کشش ہوتی اور آپ کو ہم نے اپنے کرنیلوں میں شامل کر لیا۔ تاکہ استفادہ بڑھے۔

یہ بھی اپنی عادت ہے کہ کبھی کبھی میں عادت کے خلاف کوئی "قلمی عمل کر بیٹھتا ہوں۔ بلکہ ساخت ایسی ہے کہ اگر کوئی خاص چیلنج میرے سامنے ہو تو کوئی ایسا اقدام بھی کر لیتا ہوں جس کا تصور کم ہی لوگ قبل از وقوع کر سکیں۔

یہی صورت چہار سو کے خیر مقدم میں ہوئی۔

مشتاق احمد یوسفی (کراچی)

خوش قسمتی سے آپ کے خط پر (حسب معمول) تاریخ درج نہیں' ورنہ احساس تاخیر اور اظہار ندامت اسی قدر زیادہ ہوتا۔ پہلے' حسب الارشاد' چند سطریں شفیق الرحمٰن سے متعلق:۔

"پطرس کے بعد شفیق الرحمٰن پہلے مزاح نگار ہیں جس نے اردو ادب کو جدید مغربی مزاح اور مزاج سے روشناس کرایا۔ انہوں نے اپنے بعد آنے والوں ہی کو نہیں۔ اپنے ہم عمر اور ہم عصر شگفتہ نگاروں کی طرز تحریر پر بھی اپنا شوخ و شنگ عکس چھوڑا ہے۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس نے شفیق الرحمٰن سے کسب فیض نہیں کیا۔ برجستگی' شگفتگی اور شائستگی میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔" آپ ایک شمارہ ان سے منسوب کر رہے ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ ایک شاندار جشن بھی منانا چاہئے۔ "چہار سو" جس پابندی سے شائع ہو رہا ہے' بالکل اسی پابندی کے ساتھ مفت مل رہا ہے۔ پڑھتا ہوں۔ خوش ہوتا ہوں۔ آپ کی جواں حوصلگی پر رشک کرتا ہوں آپ کے علم میں یقیناً ہوگا کہ ڈیڑھ سو سالہ Punch بند ہو گیا۔ کسی نے ماتم نہیں کیا۔ میں "اردو پنچ" کے باب میں حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا' مگر میرا خیال ہے کہ طنز و مزاح پر مشتمل اعلیٰ معیار کا رسالہ نکالنا ممکن نہیں۔ ہر شمارے کا پیٹ بھرنے کیلئے جس قسم کی نظمیں اور مضامین شائع کرنے پر ایڈیٹر------ کوئی بھی ایڈیٹر------ مجبور ہوتا ہے' وہ ماہ بماہ اس کی قدر و وقعت کم سے کم تر کرتے چلے جاتے ہیں۔ کرنل محمد خان صاحب سے ملاقات نہ ہونے کا ملال ہے۔ وہ شہر مزاح نگاراں---- اسلام آباد---- کے قطب ہیں۔ آپ کو میں نے جان بوجھ کر قطب کا درجہ نہیں دیا۔ اس لئے کہ سنا ہے' قطب اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ جب کہ آپ کا پاؤں ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ اور اگر آپ کو یکے از ابدال کہوں تو اندیشہ ہے کہ ہمارے پیر و مرشد کو حسن ابدال والے اپنے حصے کا تبرک سمجھ کر جھپٹ لیں گے۔ آپ نے "چہار سو" کیلئے تازہ تحریر کی بھی فرمائش کی تھی۔ میں آج کل تقریروں میں بری طرح مبتلا ہوں۔ ان سے جانبر ہوا تو شاید تحریر کی باری آئے۔ تقریر پر یاد آیا کہ گزشتہ ہفتے لاہور کی ایک تقریب میں ایک مہمان نے ازراہ قدردانی فرمایا کہ ہم نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ان کی کتاب "چراغ تلے" خریدی۔ کتاب میں ان کا ایک اچھا سا فوٹو تھا۔ مگر تحریر اس سے بہتر نکلی۔ حجاب مانع تھا' ورنہ غالباً کہتا یہ تھا کہ یہ دونوں چیزیں' تیسری چیز یعنی اصل سے بہت بہتر نکلیں! سو ذرا تفصیل سے لکھئے کہ اس ہجو ملیح کا کون سا حصہ درکار ہے۔ احباب کو سلام پہنچے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (بھارت)

اسلام آباد میں آپ سے ملاقات تو کیا ہوئی آپ کی ایک جھلک سی دیکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بھاگم بھاگ کے دور میں یہ بھی غنیمت ہے

سلطان رشک سے کہیے مجھے "نیرنگ خیال" نہیں مل رہا؛

اردو کے جرائد برطانیہ اور امریکہ سے میرے نام آتے ہیں۔ جن سرزمینوں سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔ مگر۔ راولپنڈی۔ میری زادبوم کا "نیرنگ خیال" میرے نام آنا بند ہوگیا۔ تو گویا بقول گرامی

نے کہ نالاں است پیش چوب نیست
چوب نالہ۔ دل نہ نالہ خوب نیست

اسلام آباد سے دہلی روانہ ہوگیا۔ لاہور میں---- یونیورسٹی میں ایک لیکچر تھا۔ علامہ اقبال کے فکر و فن پر اس کے بعد قطر کا سفر تھا۔ وہاں سے ایک دن کے لئے دہلی آیا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں دو "ایڈریس" دینے تھے۔ P.H.D کے لئے اس کام سے فارغ ہو کر اسی رات کو دوبئی روانہ ہو گیا جشن قتیل کی صدارت کے لئے جشن قتیل دوبئی ابو ظہبی اور العین میں منعقد ہوا۔ ہر جگہ مشاعرے بہت کامیاب رہے۔

اب آئندہ برس---- بشرط زندگی و خیریت--- اس خاکسار کا جشن متحدہ امارات میں منایا جا رہا ہے۔ چہارسو---- (چارسو) کی دید کا منتظر ہوں۔

-----خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں

محترمہ ادا جعفری (کراچی)

خدا کرے آپ اور متعلقین خیریت سے ہوں۔ آپ کے دونوں نوازش ناموں کی "مقروض" ہوں۔ اور شکرگزار بھی۔ اللہ کے فضل سے عامر کی شادی بخیر و خوبی تکمیل پذیر ہوئی۔ بچے اور ان کے بچے امریکہ سے آئے' خوشیوں میں شریک ہوئے اور اب واپس بھی جا چکے ہیں۔ ان سب کی کمی اپنی جگہ لیکن نئی دلہن---- مایا--- کی موجودگی کی وجہ سے دل بستگی کا سامان بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عطا کر دیا ہے۔

"چہارسو" کا پہلا شمارہ ملا۔ نہایت وقیع' حسین اور فکر انگیز۔ آج کی گھبرائی ہوئی زندگی کو ایسی خوبصورت اور دلکش سوغات دینے پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ مضامین نظم و نثر پسند آئے۔ خاص طور پر گوشہ ممتاز مفتی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون ----- "اکیسویں صدی کا استقبال" ------ اور یہ بھی خاص بات کہ آپ نے "چہارسو" کو کسی ایک حلقۂ فکر یا ارضی تک محدود نہیں رہنے دیا۔ رہی میرے گوشے کے بارے میں آپ کی فرمائش۔ آپ تو آگاہ ہیں میں بیٹھ کر لکھتی رہی .... لکھتی رہی ..... اس سے آگے سوچا ہی نہیں۔ اور اب آپ کے خلوص کو جانتی بھی ہوں اور مانتی بھی ہوں۔ تعمیل ارشاد کی کوشش کروں گی۔ انشاء اللہ

دلیپ سنگھ - نئی دہلی

امید ہے آپ ہمیشہ کی طرح خوش و خرم ہوں گے۔

قتیل صاحب کے ہاتھ اپنی کتاب کی ایک جلد بھیج رہا ہوں۔ اس میں کوئی چیز اچھی لگے تو مجھے ضرور لکھئے۔ آپ کی کوئی نہ کوئی چیز ادھر ادھر سے پڑھنے کو مل جاتی ہے تو دل کھل اٹھتا ہے۔

ادھر کا دورہ کب ہوگا؟

مختار زمن

برادردم ضمیر صاحب

آپ کا خط یعنی مکتوب پہنچا۔ گلزار جاوید صاحب کا جب خط ملا تھا تبھی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ انہوں نے میری ناچیز تصانیف پر بارش کرم کی ٹھانی ہے۔ لیکن بات صاف نہ تھی۔ اب آپ نے بات صاف کر دی۔ میں یوں تو اپنی پبلسٹی یا پبلک ریلیشنز سے پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ میں انشاء اللہ بعد عید یہ خدمت بھی انجام دوں گا (میں نے پبلسٹی والی بات بھی از راہ تکلف لکھ دی کہ طریقہ یہی ہے)

آپ کراچی آئے بھی اور آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ وجہ یہ تھی کہ میری بیوی کے خاندان میں قریبی عزیز بیمار تھے لہٰذا موڈ کچھ اچھا نہ تھا۔ بہر صورت عشائیے کے بہانے آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میرے مضامین افکار احمد عدنی صاحب شائع کر رہے ہیں۔ ان کا اکٹھا کرنا بھی ایک مشکل کام ہے مگر انجام دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری بیوی سلمٰی ہی سارا کام کرتی ہیں۔

بشریٰ رحمٰن

شاہ سئیں--- شاہ ضمیراں!

ابھی میں بہاولپور سے لوٹی ہوں۔ ہمارے ہاں رواج ہے جہاں کسی سید کو دیکھتے ہیں۔ پاؤں کو ہاتھ لگا کر کہتے ہیں۔

"سید دی ذات کوں سلام"

سو آج آپ کی سالگرہ بھی ہے اور سنا ہے کہ جشن سالگرہ کا اہتمام بھی ہو گا گلزار جاوید نے مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا تھا۔ میں نے ملتان اور

بہاولپور کے درمیان اس بار اتنے سفر کئے کہ محبت صفر ہو گئی۔ اس پر مجبوری یہ کہ ہمارے خداوند مجاز پندرہ روزہ غیر ملکی دورے کے بعد کل ہی تشریف لائے ہیں۔

ایسے مشبھ موقع پر میں اپنی لا تعداد ان گنت دعائیں ہی بھیج رہی ہوں۔ آپ جگ جگ جئیں۔ پھولتے جھومتے نظر آئیں۔ آپ کی دور بلائیں۔ آپ صحت و سلامتی سے منہائیں۔ آپ جم جم جشن منائیں خدا آپ۔ کو ہمیشہ حفظ و امان میں رکھے آمین۔ اس سے زیادہ تو ہم اس محفل میں بھی نہ کہہ سکتے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن (نیویارک)

یہاں آنے کے بعد کام نے وہ دبوچا کہ کچھ نہ پوچھئے میں کتنا ناشکرا آدمی ہوں کہ اسلام آباد میں آپ کی مہمان نوازی میں شکریے کے اظہار کے دو لفظ تک نہ لکھ سکا۔ آپ تو خیر مگر آپ کے دوسرے احباب جنہوں نے اس شاندار تقریب کے سلسلہ میں مجھ پر احسانات کئے۔ وہ کیا کہتے ہوں گے۔ (میرا ریکارڈ درست کرنا اب آپ کا کام ہے) ------کراچی میں ادا جعفری صاحبہ کی معرفت بھجوائی گئی تصاویر اور "وڈیو فلم" بھی مل گئی۔

یہاں کی سرگرمیاں ویسی ہی ہیں نیویارک میں شعراء کی کھچڑی پہلے کی طرح پک رہی ہے۔ کوئی سمجھوتا ہوتا نظر نہیں آتا۔ بہرحال ہم اس دھینگا مشتی سے متاثر نہیں ہیں۔ احباب چوہدری یونس ڈاکٹر ذوالفقار گلزار جاوید صاحبان کو سلام اور مسز ضمیر جعفری کی خدمت میں ہم دونوں کا آداب!!

پروفیسر خالق طور (کمپالا یونیورسٹی افریقہ)

بلفضل تعالیٰ آپ بخیریت ہوں گے۔ گوناں گوں مصروفیات اور بلا گزشتہ کسی شناسائی کے آپ نے مجھے وقت دیا۔ تہہ دل سے مشکور ہوں۔

"نمائت تالیف" کے چند کاغذات چھوڑ آیا تھا مل چکے ہوں گے اور آپ نے جو کچھ رقم کیا ہوگا یورپی شاعری سے تقابل کے یہ چند صفحات ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ کا ادبی حلقہ اہمیت دے گا۔ کہ یہ منفرد نوعیت کا کام ہے۔

پرچہ "چہار سو" دیکھا ہے۔ اچھا خاصہ ادبی معیار لئے ہوئے ہے۔ تحریر بھی بوجھل نہیں۔ ہلکی ہلکی مزاح کی چاشنی ساتھ ساتھ ہے۔ آپ اس مجلّہ کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ یہ تو گھر آکر ہی پڑھا گیا۔ اصل میں جس روز آپ سے ملنا ٹھہرا تھا بے دھیانی میں نظر کا چشمہ گھر بھول آیا۔ لہٰذا کچھ

بھی پڑھنے سے قاصر تھا۔ بہرحال اردو ادب کے فروغ میں آپ کی خدمات قابل ستائش ہیں۔

افتخار امام صدیقی (بمبئی بھارت)

محترمی جعفری صاحب --- آداب

آپ کا خط تحریرہ 3 اگست اور سپرد ڈاک 3 ستمبر' آج 12 اکتوبر کو موصول ہوا۔ پتہ غلط ہونے کے سبب مجھ تک غیر معمولی تاخیر کے ساتھ پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ پہنچ تو گیا۔ اس عنایات کیلئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ بمبئی نمبر غلط ہونے کی وجہ سے یہ تاخیر ہوئی۔ اس خط کے سرنامے پر میرا نام اور پتہ درج ہے۔ اپنے یہاں نوٹ کر لیجئے۔ اب ایک شک یہ باقی رہ گیا ہے کہ آپ کے خط کے مطابق رسالہ "چہار سو" میرے نام ارسال کیا گیا ہے۔ اب اگر پتہ غلط ہے تو رسالہ ادھر ادھر ہو گیا ہوگا۔ آپ نے رسالہ جاری کیا یا نہیں۔ جو بھی ہے' آپ کا خط موصول ہونے کے بعد ہی یہ شک دور ہو سکے گا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر' میں اپنی تخلیقات ضرور ارسال کروں گا۔ پہلے تو آپ میرے ادھورے کام کرنے کی زحمت کیجئے۔ اپنی تازہ و غیر مطبوعہ نثری و شعری تخلیقات۔ اپنا فوٹوگراف اور سراغی اشاریہ۔ چہار سو کے حالیہ شمارے۔ ان تمام زحمتوں کیلئے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ اس خط کے ساتھ شاعر کا حالیہ شمارہ افسانہ نمبر آپ کے ملاحظے کیلئے پیش ہے۔ اپنی گرانقدر رائے سے نوازیے اور چہار سو میں اس پر تبصرہ بھی کیجئے۔ انشاء اللہ' اب شاعر کا آپ سے باضابطہ رشتہ بنا رہے گا۔ آپ کا قلمی تعاون اور ادبی سرپرستی میرے لئے مشعل راہ ہوگی۔ آپ کے شفقت نامے کا انتظار رہے گا۔ امید کہ مزاج اچھا ہوگا۔

حمیرہ رحمان (نیویارک)

شرمندہ ہوں کہ اتنے دنوں کے بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ نہ جانے کن کن مصروفیات کا شکار رہی۔ بچوں کی چھٹیاں بھی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے سوچنے تک کی مہلت نہیں دی۔ بہرحال خدا خدا کر کے اسکول کھلے ہیں دعا اور انعام دونوں نے سکول جانا شروع کیا ہے۔ چہار سو کے ابتک تین شمارے ملے ہیں۔ کل جو شمارہ پہنچا ہے بے حد جاندار ہے۔ جمیل جالبی صاحب کے لئے ایسے ایک نمبر کی ضرورت تھی۔ شاعری کا حصہ بھی بے حد اچھا ہے۔ مجھے خدا کی قدرت اور آپکی محنت پر پورا بھروسہ ہے انشاءاللہ چہار سو بہت جلد مقبولیت کے سارے خوبصورت مرحلے طے کرے گا۔